ایم ظہیر

نصرت شہاب چوہدری

زینۂ صبا

نصرت چوہدری

بار اوّل ــــــــ ۱۹۷۷ء

تعداد ــــــــ ایک ہزار

ناشر ــــــــ ممتاز نصرت

کتابت ــــــــ افضل الکتابت بلاک نمبر ۱۹ سرگودھا

پریس ــــــــ انعام آرٹ پریس سرگودھا

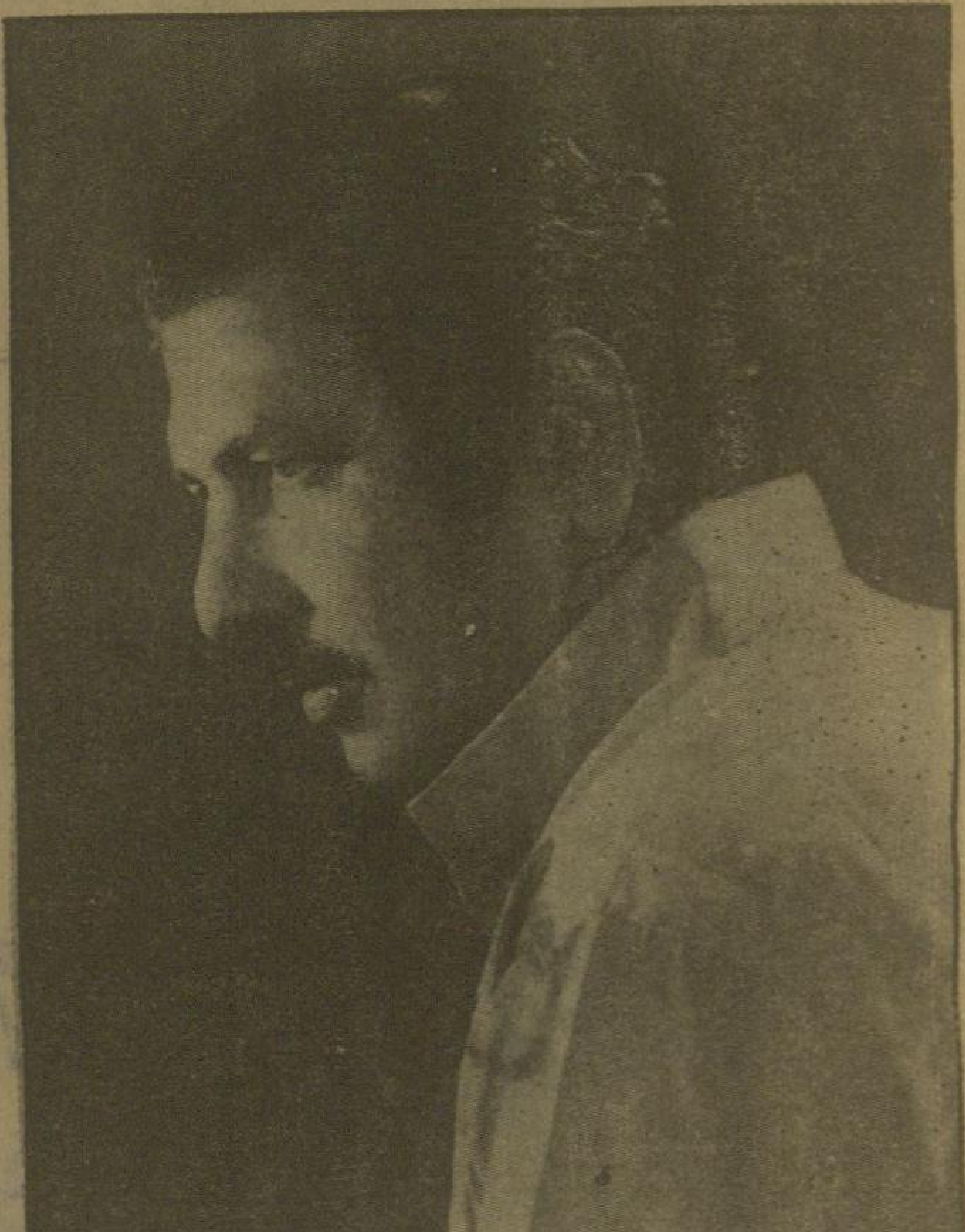
قیمت ــــــــ بارہ روپے

ملنے کا پتہ

اشرف بک ڈپو اردو بازار سرگودھا

کتاب مرکز اردو بازار بھکر ضلع میانوالی

آئینۂ ادب سرکلر روڈ لاہور



نصرت چوہدری

شاید کوئی ملاپ کی صورت دکھائی دے

میں زینۂ صدا پہ مسلسل سفر میں تھا

انتساب!

جمیل یوسف کے نام

اک لالۂ صحرائی!

ہر شاعر کا ایک عقبی دیار ہوتا ہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کی شاعری پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے نصرت چوہدری کے سلسلے میں اس کا عقبی دیار تھل ہے۔ تھل دراصل صحرا کا علاقائی نام ہے۔ اور اس نام کو سنتے ہی چشمِ تصور کے سامنے ریت کے ٹیلے آسمان اور زمین کی لا انتہا وسعت اور زندگی کی سادگی اور یکتائی کے جملہ نقوش اُبھر آتے ہیں۔ صحرا محرومیوں کی ایک طویل داستان بھی ہو سکتا ہے اور کشف و عرفان کی جملہ منازل کو طے کرنے کا وسیلہ بھی۔ صحرا میں زمین پر انسان اور آسمان پر سورج ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ملتے ہیں اور آخر آخر میں دونوں ایک ہی ہستی بن جاتے ہیں۔ ٹی۔ ای۔ لارنس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ صحرا کا بدو خُدا کو اپنی ذات کے بطون میں نہیں بلکہ خود کو خدا کی ذات میں موجود پاتا ہے۔ بعینہٖ جیسے وہ خود کو آفتاب کی بے کنار روشنی اور صحرا کی لامتناہی وسعت کے دائرے میں مقید دیکھتا ہے مگر اسی صحرا میں ایسی ایسی ہستیاں بھی تو پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے باہر کی روشنی کو اپنے قلب کی کٹیا میں جلتے ہوئے دیکھا اور پھر اسی روشنی سے سارے عالم کو منور کر دیا گویا اندر کی دنیا باہر کی روشنی کو منقلب کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ نصرت چوہدری نے تھل کی بے کنار وسعتوں سے کوئی ایسا روحانی رشتہ تو استوار نہیں کیا۔ مگر یہ صحرا اس کے لئے ایک عقبی دیار بن کر اس کی محرومیوں کو بعض واضح علامتوں میں متشکل کرنے میں کامیاب ضرور ہوا ہے۔ مثلاً تھل میں روئیدگی عنقا ہے اور روئیدگی کی حسین ترین صورت یعنی چمن کے گلِ نورمیدہ کا تو نام و نشان تک نہیں چنانچہ ردِعمل کے طور پر نصرت چوہدری کی شاعری میں پھول ایک مرکزی حیثیت اختیار کر گیا ہے مگر یہاں بھی کوئی عام سا پھول اس کے لئے دامن کش دل نہیں۔ اس نے پھولوں کے

بادشاہ یعنی گلاب سے رشتہ استوار کیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ گلاب صحرا کا وہی سورج تو نہیں جو ہر روز صحرا کی کشتِ ویراں سے اُگتا اور پھر شام کو پتّی پتّی ہو کر اُفق پر بکھر جاتا ہے؟ اگر یوں ہے تو پھر سوچنا پڑے گا کہ نصرت چوہدری نے نقل سے کچھ بلاواسطہ اثرات بھی ضرور قبول کئے ہیں گو یہ اثرات زیادہ سے زیادہ بعض علامتوں کی حد تک ہیں تاہم اصل بات یہ ہے کہ صحرا نے نصرت چوہدری کے ہاں ایک ایسی تشنگی کو ابھارا ہے جو پانی کے لئے نہیں بلکہ خوشبو کے لئے ہے مراد یہ کہ اس تشنگی کو پانی کا مشکیزہ نہیں بلکہ خوشبو کا مشکیزہ یعنی پھول درکار ہے۔ یوں پھول کے لئے ایک بے پناہ لگن اور پیار نصرت چوہدری کی شاعری میں اسی طور آیا ہے کہ آخر آخر میں اس کی ساری شخصیت ہی اسی کے تابع ہو کر رہ گئی ہے۔

ہر چند نصرت چوہدری کے کلام میں بعض دوسرے علامتی مظاہر بھی موجود ہیں جیسے مثلاً خیمہ، گھر، آواز اور لہو وغیرہ اور اس نے ان علامتی مظاہر کی مدد سے اپنے دلِ صد پارہ کی صد ہا بوقلموں کیفیات کو بے نقاب کیا ہے تاہم اس کی شاعری کا مرکزی کردار پھول ہے جو صحرائی زندگی کی بے برگ و بار دنیا کی تلافی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ پھول سے نصرت چوہدری کا تعلقِ خاطر کئی سطحوں پر اُجاگر ہوا ہے۔ مثلاً ایک سطح تو گھر سے متعلق ہے جہاں شاعر کو اپنی محبوبہ گلاب کی طرح تر و تازہ، عطر بیز اور گلابی نظر آتی ہے ع۔

تو کہے تو آج میں تیرے بدن کے پھول کو ۔۔۔ رات بھر رکھوں سجا کر آنکھ کے گلدان میں
تو دیکھنے میں مہکتا گلاب لگتا ہے ۔۔۔ تیرا بدن مجھے جامِ شراب لگتا ہے
بیٹھی ہے چھپ کے پھول کی پتّی میں جو صدا ۔۔۔ نصرت کسی بدن کی وہ خوشبو نہ ہو کہیں
ہر طرف کمرے میں برقی پھول روشن ہو گئے ۔۔۔ اک گلابی ہونٹ نے چوما تھا میرے ہاتھ کو

گھر کے حوالے سے ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بچہ جو گھر کا مرکزی نقطہ ہے شاعر کو

ایک پھول ہی کے روپ میں نظر آیا ہے۔

تمہاری گود میں یہ پھول کتنا پیارا لگے مجھے تو چاند کے نزدیک اک ستارا لگے

گھر کی چار دیواری سے شاعر کی نظریں سوئے فلک اٹھتی ہیں تو وہاں بھی اُسے پھولوں ہی کا منظر دکھائی دیتا ہے۔

تاروں کے پھول توڑ کے دیتی تھی جو مجھے آتی نہیں ہے اب تو وہ کالی گھٹا کبھی

تاروں نے ڈوب کر بھی وفا کا صلہ دیا سورج کا پھول شاخِ افق پر کھلا دیا

سورج کا پھول کھل کے دکھائی تو دے کبھی مجھ کو حصارِ شب سے رہائی تو دے کبھی

مگر یہ نہیں کہ نصرت چوہدری کے ہاں پھول کو محض زندگی کے روشن اور بہجت افزا رُخ دکھانے کے لئے برتا گیا۔ انھوں نے پھول کو یاسیت، افسردگی اور موت کا سمبل بھی بنایا ہے ع

جب تیر میرے جسم کی دیوار پر لگے اشکوں کے پھول کیوں مرے رخسار پر لگے

گر پڑی ہے ٹوٹ کر کیوں خیمۂ گل کی طناب کیا لٹیرے آ رہے ہیں ہاتھ میں خنجر لئے

بُنتی تھیں روز لڑکیاں پھولوں کی چادریں بستی شہید کی میرے گاؤں کے ساتھ تھی

دھرتی کا خون سُرخ گلابوں میں دیکھئے چہرے چھپے ہوئے ہیں نقابوں میں دیکھئے

آنگن میں میرے ایک ہی کچا گلاب تھا اس کو بھی حادثے کی ہوا لے کے اڑ گئی

گلدان سے جب مجھ کو تیری باس نہ آئی مجھ کو مرے کمرے کی ہوا راس نہ آئی

کمرے میں دیر تک مجھے چپ چاپ دیکھ کر گلدان رو پڑا تیری تصویر رو پڑی،

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ نصرت چوہدری کے ہاں پھول اس کی اپنی ذات کا سمبل بن کر بھی نمودار ہوا ہے۔ یوں اس علامت میں دوہری معنویت پیدا ہو گئی ہے اور پھول سے اس کا تعلقِ خاطر اس مقام پر جا پہنچا ہے جہاں پھول اور شاعر میں مغائرت کی کوئی خلیج تک باقی نہیں رہی اور دونوں یک جان دو قالب ہو گئے ہیں —— یوں کہ پھول کے سراپا سے شاعر کو اپنی باس اور پھول کی رگوں میں اپنا خون موجزن نظر آنے لگا ہے۔

سونگھا تو اس کی باس نے چونکا دیا مجھے — میرا ہی وہ لہو ہے جو گل کی رگوں میں ہے
اب میری جانب اٹھا کے آنکھ بھی تکتا نہیں — کل سجا کر خوش ہوا تھا جو مجھے گلدان میں
گل کی شریانوں میں دوڑائی ہے میں نے زندگی — شاخ توڑو گے تو میرے خون کی بو آئیگی

نصرت چوہدری لالۂ صحرائی تھا۔ فن کی آنچ نے اُسے چمن کے گلاب میں تبدیل کر دیا اور وہ صحرا کی مٹی سے اکھڑ کر شہر کے گلدان میں منتقل ہو گیا۔ مگر شہر بڑا بے رحم ہے۔ منافقت احسان فراموشی اور بدلحاظی اس کی گھٹی میں ہے اور وہ ہمیشہ پھول کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کرتا آیا ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ کم از کم نصرت چوہدری شہر کے اس روایتی ناروا سلوک کے باوجود ہمیشہ تر و تازہ رہے گا اور اپنی خوشبو دور دور تک پھیلاتا چلا جائے گا۔

وزیر آغا

وزیر کوٹ ۲۰ جولائی ۷۷ء

کلیم "انا" پرست : "نُصرت چوہدری"

نُصرت چوہدری

کے کلام کا ـــــــ تنقیدی جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر خیالؔ امروہوی ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (تہران یونیورسٹی)

بیشتر ارباب بصیرت کو راقم سے یہ شکوہ ہے کہ میں انسانی زندگی کو صرف ایک ہی رُخ سے دیکھنے کا عادی ہوں جب کہ زندگی گوناگوں اور بوقلموں زاویوں کی حامل ہے۔ میرا جواب اس ضمن میں یہ ہے کہ انسانی زندگی کی رنگا رنگی اور نیرنگی کا جب بھی تجزیہ کیا جائے گا ان میں اضدادیت کا عمل دخل ضرور ہوگا اور اضدادیت ہی کسی مثبت نتیجے پر پہنچانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ جسے کارل مارکس کی اصطلاح میں "DIEALACTICAL MATERIALISTIC APPROCH" کہا جاتا ہے کیونکہ اس اسلوب کے بغیر ہم محض عینیت، "IDEALISM" کو پیشِ نظر رکھ کر کسی بھی موضوع کا صحیح نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون کی استقراری اور استخراجی منطق کے بعد اس امر کی ضرورت پیش آئی کہ منطق کی ایک اور شاخ اضدادی منطق "DIEALACTICAL LOGIC" ایجاد کی جائے۔ اس منطق کی رُو سے صرف اثبات اور نفی ہی تک بات محدود نہیں رہی بلکہ نفی کی نفی ـــــ "NEGATION OF NEGATION" سے اثباتی نتائج اخذ کیے جاتے ہیں، یہاں چونکہ فلسفہ اور منطق کے مباحث مقصود نہیں بلکہ ادب پیشِ نظر ہے اس لیے "ادب" کے

سلسلے میں بھی ہمیں "ادب کے" مادی نظریات کے اصولوں کی روشنی میں اپنی بحث کا آغاز کرنا ہوگا جو بالآخر اضدادی اور جدلی تجزیے تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں بہت کم ادیب اور شاعر ایسے ہیں جو طبقاتی کشمکش اور سماجی تضاد سے پیدا ہونے والی شکست و ریخت کو سمیٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ہمارے یہاں ترقی پسندانہ تجزیات کے باقاعدہ سکول کی بنیاد پڑنے ہی نہیں پائی اگر اجتماعی طور پر کبھی ایسی کوشش کی بھی گئی تو رجعت پسندوں نے اسے اکھاڑ پھینکا۔ تاہم ہماری ادبیات میں روایت پسندی کی وبا عام رہی خواہ، وہ قدیم ہو یا جدید، بہرحال اس سے ہٹ کر منفرد انداز میں کسی نے سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ شاعر ہو یا ادیب سماج ہی کی پیداوار ہے اور اس لئے معاشرے کے اثرات کو قبول کرنا ناگزیر ہوتا ہے لیکن قبولیت اور عدم قبولیت کی شرط یہ ہے کہ وہ شعوری بھی ہو لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ اہلِ فکر شعوری طور پر اپنے افکار میں اس کا واشگاف انداز میں اظہار نہیں کر سکتے یا کرنا نہیں چاہتے۔ اس سے جہاں قاری تخلیق سے مکمل طور پر بہرہ مند ہونے سے قاصر رہا وہاں اہلِ قلم ادبیات کے ارتقاء کے ضمن میں نمایاں خدمات انجام نہیں دے سکے۔ تاہم کچھ اہلِ فکر ایسے ہیں جو معاشرے کی تبدیلیوں کو شعوری طور پر محسوس کر کے انہیں فن کی ندرت دینے کی صلاحیت سے بہرہ ور رہے ہیں۔ اس مفروضے کے تحت میں جناب نصرت چوہدری کے جس شعر سے اپنی بحث کا آغاز کرنا چاہتا ہوں اس کے پیشِ نظر یہ شاعر کی وہ شعوری اپچ ہے جو عصری تقاضوں کو سمجھنے کی دعوت دیتی ہے۔ نصرت چوہدری نے کہا:

لفظوں کے بیچتا ہوں پیالے خرید لو　　　شب کا سفر ہے کچھ تو اجالے خرید لو

اس شعر میں اثبات اور نفی کے امتزاج سے شاعر منطقی نتیجہ نکالنا چاہتا ہے کہ ہمارا زیرِ بحث شاعر نصرت چوہدری۔ نور و ظلمت، خیر و شر اور پست و بلند کے تفاوت

سے آشنا ہے اور اُنہیں الفاظ کے ذریعے ابلاغ بھی کرا رہا ہے اور ساتھ ہی عمل کی دعوت بھی دیتا ہے کہ اس کی فکر کے ساتھ ساتھ چل کر ظُلمت میں اُجالے کی تلاش کر لی جائے ساتھ ہی اس میں یہ جسارت بھی موجود ہے کہ وہ امیرِ شہر سے بھی آنکھیں چار کر سکتا ہے اور "SATIRE" "طنز کو بھی اپنی جسارت کا حل سمجھتا ہے۔

؎ ہوگا امیرِ شہر کا مجھ سے نہ احترام میری زباں کے واسطے تالے خرید لو

اضدادیت کی "رَو" سے شاعر کا یہ تجزیہ بڑے کام کی چیز ہے۔ کیونکہ اسی تضاد کا نتیجہ ہے کہ وہ اس سماج کے اثباتی اور منفی برزخ میں کرب و اضطراب کے ساتھ ایک ایسا نتیجہ پیش کرتا ہے جو انسانی المیہ کہلا سکتا ہے اسی کو "SYNTHESIS" کہتے ہیں یعنی اثبات اور نفی کے ردِ عمل سے ہماری زندگی پر جو اثر پڑتا ہے وہ اضدادی منطقی نتیجہ کہلاتا ہے۔ اِس نتیجے کو شاعر نے مجسم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب ہوا ہے مثلاً

؎ اپنے کندھوں پر اٹھائے آپ اپنی لاش کو چل رہا ہوں رات دن میں سانس کی تلوار پر

شاعر جو کچھ بھی کہتا ہے اُس کے کردار سے اُس کی اپنی ذاتی بپتا نہیں بدلتی بلکہ ہر فرد یا طبقے کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسی لیے لازمی ہے بھی اور نہیں بھی کہ اقتصادی طور پر شاعر واقعی لاش ہے یا نہیں۔ تاہم یہ امر مسلّم ہے کہ کچھ افراد لاشیں ہیں، اور سماج اس کا گورستان! یہ شعر بھی اس دور کی غلط طبقاتی اقدار اور اس کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والے اثرات کی بہترین مثال ہے۔ میری نظر میں شاعر کے فرائض میں جہاں والٹیئر، حالیؔ اور اقبالؔ کی طرح انقلابی حربوں سے سماج کے پرخچے اڑانا لازمی ہے وہاں فکرِ ذات اور تدبیرِ کائنات بھی ایک مقدس فریضہ ہے۔ نصرت چوہدری صاحب نے ان فرائض کو بھی بدرجۂ اتم پورا کیا ہے اور اپنی سوچ کے انداز سے دوسروں کی سوچ پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ان کے اشعار پر اس انداز کی انفرادیت

ملتی ہے۔

سوچوں کی قبروں پر بیٹھا رات گئے
میں لفظوں کے دیپ جلاتا رہتا ہوں

پاگل ہو کر ذہن کی اندھی گلیوں میں
چاند کو اپنے پاس بلاتا رہتا ہوں

اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ نصرت چوہدری کو ایک اور تجزیہ کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ تجزیہ دورِ حاضر کا سیاسی اور سماجی قلابازیوں اور بے بنیاد نظامِ زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔

بادل گرج پڑے تھے ہوا لڑکھڑائی تھی — شاید کوئی کرن مرے کمرے میں آئی تھی

یہ شعر رومانی بھی کہلا سکتا ہے تاہم میں مضمون کے "SEQUNCE" میں نصرت چوہدری صاحب کے جن اشعار کا اطلاق عصری تقاضوں پر کرنا چاہتا ہوں، اُن میں رومان کو کم ہی دخل ہے کیونکہ رومان کا تصور رجعت پسند اور "IDEALIST" سوسائٹی میں کچھ اور ہے آنے والا سوشلسٹ نظام میں کچھ اور۔ لہٰذا میں مستقبل ہی کے پیش نظر یہ کہہ سکتا ہوں کہ رومان بھی ہماری سماجی زندگی کے تابع ہے اس میں دلکشی اور جاذبیت تب ہی آسکتی ہے جب ہمارے خارجی اثرات کے شکنجوں سے ہمیں نجات ملے تاکہ داخلی واردات کا بھی ذائقہ چکھا جائے۔ یا اس سے سبق حاصل کیا جائے۔ جب ایسی صورت ہو تو کسی شاعر کی ذاتی واردات سے قارئین یا سامعین کو خارجی طور پر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا! اس اعتبار سے ہم اگر نصرت چوہدری کی عشقیہ واردات کا بھی تجزیہ کریں گے تو یہاں بھی وہی فارمولا استعمال کرنا ہوگا جس کی وساطت سے ہم قبلہ چوہدری صاحب کے اشعار سے نتائج اخذ کر چکے ہیں۔ جناب نصرت چوہدری کے اشعار میں تنقیدی حربہ نہایت مؤثر ہوتا ہے۔

۵ کیا تھی وہ فردِ جرم جو تعزیر کی گئی — ہونٹوں کے ساتھ سوچ بھی زنجیر کی گئی

ظاہر ہے کہ فردِ جرم حق گوئی اور بے باکی ہی ہو سکتی ہے میں یہاں یہ نہیں کہہ سکتا کہ نُصرت چوہدری بقول خیال اللہ کے شیر ہیں یا نہیں تاہم ہمارے معاشرے کے شیر ضرور ہیں اور اُن کی یہی دلیری اُن کے اشعار میں جگہ جگہ موجود ہے۔ اسی بے باکی نے اُن سے یہ شعر بھی کہلوایا۔

؎ سُورج کا خون رات کی دہلیز پر پڑا — چھینٹے لہو کے شام کی تلوار پر بھی تھے

اس شعر میں بھی علامتوں کے ذریعے طبقاتیت کے وجود اور اس کے معرضِ وُجود میں آنے والے مؤثرات کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً ہم اگر سُورج کو استحصالی طبقہ اور شب کو مظلوم اور پامال طبقے کی علامت قرار دے کر شام کو ایک ایسا طبقہ تصوّر کریں جس پر ففتھ کالمسٹ 5 TH یا "URBAN-LEFT" کی اصطلاحات صادق آتی ہوں تو موجُودہ بہت بڑی سماجی سازش کا انکشاف ہو جاتا ہے جو ہر لمحہ جاری ساری ہے۔ اس اعتبار سے یہ شعر صداقت پر مبنی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ میرے اپنے مفرُوضے "HYPOTHESIS" کے معیار سے چوہدری صاحب نے اور بہت سے شعر کہے ہوں لیکن جو منتخب اشعار مجھ تک پہنچے ہیں ان میں بیشتر جگہ نُصرت چوہدری صاحب کا آئیڈیل محبوب رقص کرتا ہوا ملا جس نے دورانِ تجزیہ کافی تنگ کیا کیونکہ مقالے کی نوعیّت کے پیشِ نظر میری کوشش یہی رہی کہ چوہدری نُصرت کو اپنے معاشرے کا ایک حقیقت پسند اور انقلابی شاعر ظاہر کروں، لیکن اس کوشش میں جب کئی جگہ زُلف لہراتی سبزہ چمکتا دمکتا اور جسم وجاں کا ہیولیٰ تھرکتا نظر آیا اور وہ یوں کہ اگر ہم نُصرت چوہدری کے محبُوب اور اس کے معاملات ہی کا ساتھ دیں تب بھی ہمارے معاشرے کی ان اقدار پر توجہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے جن کی وجہ سے ایک شاعر کو اپنے 'IDEAL' کے حصول میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ان دشواریوں سے احساس و وجدان جس طرح گھائل ہوئے یا ہوتے رہے وہ بھی ہماری رجعت پسندانہ تہذیب اور جیتے جاگتے

تمدن کی کرب و بلا سے کم نہیں ہے۔ بقول نصرت چوہدری

آکر فضا میں سرچ کی تصویر کھینچ دی
اُٹھ کر ترے مکاں سے دھوئیں کی لکیر نے

اس شعر میں شاعر نے نئے انداز سے ایک ایسی کیفیت کی عکاسی کی ہے جس میں نارسائی کا عمل دخل ہے ایک ایسی یاد نے شاعر کو اظہارِ قربت کا مجسمہ بنا دیا ہے جس کا احساس تیسرے آدمی کو کم ہی ہو سکتا ہے۔ اِس ضمن میں یادوں کا ایک سلسلہ اور آرزوؤں کا ایک ہجوم جو نصرت چوہدری سے درج ذیل شعر کہلواتا ہوا نظر آتا ہے

؎ گھر کی دہلیز پہ بیٹھے ہوئے بچے کی طرح — مَیں تری دیکھ کے تصویر پُرانی رویا
بامِ اُفق پہ جلوہ نما تُو نہ ہو کہیں، — یہ چاند بھی ترا خمِ ابرو نہ ہو کہیں
آئی ہے رات دوش پہ کیوں چاندنی لئے — عُریاں کسی جگہ ترا بازو نہ ہو کہیں

ان اشعار کے علاوہ نصرت چوہدری نے مختلف انداز سے رُومانی مافی الضمیر کو ادا کیا ہے جن سے ان کے اسلُوب کی انفرادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قلبی واردات اور عشقیہ اظہارِ بیان کے بعد ہم ان کے ایک ایسے شعر پر بحث کریں گے جو اُن کے فکری اور غنائی زاویوں، سے روشناس کرا سکے گا۔

؎ اَب مری جانب اٹھا کر آنکھ بھی تکتا نہیں
کل سجا کر خوش ہوا تھا جو مجھے گلدان میں،

ہم آج کے شاعر سے بہت زیادہ حد تک اس بات کی اُمید رکھتے ہیں کہ وہ ذاتی سے زیادہ کائناتی بن کر ہمارے سامنے آئے کیونکہ شاعر کا وجود صرف اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں پامال اور روایتی انداز سے مظاہرِ فطرت سے روشناس کراتا رہے کیونکہ مظاہرِ فطرت کو ظاہری طور پر آنکھ دیکھ لیتی ہے اور حظ بھی اٹھا لیتی ہے۔ البتہ اگر شاعر مظاہرِ فطرت کے معنوی رُموز سے نئے انداز سے کچھ روشنی ڈالتا رہے

تو اس کی حیثیت دوسرے کی نسبت ممتاز ہو جاتی ہے تاہم اب یہ موضوع باعمل ہو چکا ہے کہ ہمیں ایک ایسے شاعر کی ضرورت ہے جو کم از کم صدی دو صدی آگے کی باتیں ہمیں بتائے۔ تہذیبی کارواں کے ساتھ قدم بہ قدم ہی صرف نہ چلتا رہے بلکہ چند قدم آگے بڑھ کر سفر مینا کا بھی کام دے۔ ہم اسے "پامسٹ" "PALMIST" پروہت یا ملہم غیبی کی حیثیت میں بھی دیکھنا نہیں چاہتے بلکہ چاہتے یہ ہیں کہ وہ عصری تقاضوں اور رونما ہونے والے سماجی واقعات کو سائنٹفک انداز میں بیان کر سکتا ہو۔ یہ آرزو اگرچہ خاصی پریشان کن اور کڑی ہے لیکن اس آزمائش پر پورا اترنا ہی فن کاری ہے۔ جہاں نصرت چوہدری صاحب نے شعوری یا لاشعوری طور پر سماجی تجربے کئے ہیں وہ یقیناً نئی نسل کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم انہیں اپنے اسلوب کو آج کے ارتقاء پذیر تمدن کے ساتھ وابستہ کرنا ہوگا۔ ہماری اس آرزو کی متعدد جھلکیاں ان کے کلام ہی میں موجود ہیں۔

اپنی پھونکوں سے بجھائے میری پلکوں کے چراغ
اتنی ہمدردی کہاں ہے آج کے انسان میں

نصرت چوہدری اس "آذر" کی طرح ہے جو کسی ایک وضع کی صنم تراشی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ سنگلاخ وادیٔ حیات میں آشفتہ و سرگشتہ گھوم پھر کر جا بجا تیشہ زنی کرتا ہے تاکہ کوئی بہتر "مورت" اس کی صنم کاری کی وساطت سے مجسم ہو کر سامنے آ جائے اس ضمن میں اسے مایوس نہیں ہونا پڑا بلکہ کامیابی سے پہنچا ہے:

تیشۂ فن سے یہ آوازوں کے پتھر توڑ کر
سوچ کی تہہ سے کوئی چشمہ نکالا جائے گا

اس آذرانہ وثوق اور جسارت کے ساتھ ساتھ نصرت چوہدری کی نگاہ سماج کی بدلتی ہوئی اقدار سے بھی ناواقف نہیں ہے بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ:

ﮯ دیر تک موجیں اُسے پانی میں رکھ سکتی نہیں
وہ اگر موتی ہے تو اُس کو اچھالا جائے گا،

نصرتؔ چوہدری جہاں ذاتی واردات کے بحرِ بیکراں میں غرقاب ہو کر جستجو کے موتی نکال لاتا ہے وہاں بقولِ شاعر اس نے سماج کے لئے بہت کچھ سوچا۔ اس کے لئے بڑی قربانیاں دیں اور اس طرح اس نے عوام کا دل جیت لیا جیسے درج ذیل شعر سے ظاہر ہے

ﮯ گُل کی شریانوں میں دوڑائی ہے میں نے زندگی
پھول توڑو گے تو میرے خُون کی بُو آئے گی

اس شعر کو کہیں ”جنسی“ ”CONTEST“ میں نہ لے جایئے گا کیونکہ یہ شعر محنت و سرمائے کے تضاد کے سلسلے میں بہترین شعر ہے اس موضُوع کا ایک اور شعر سماعت فرمایئے:

ﮯ تیری آنکھوں میں سُرخی ہے کس چیز کی، یہ لہو بھی نہیں یہ نشہ بھی نہیں
میں نے دیکھیں تھیں پہلے بھی یہ سُرخیاں، وہ گماں اور تھا یہ گماں اور ہے

اس شعر کا مکمل اطلاق استحصالی اور استحصال شُدہ طبقات کی زندگی پر ہوتا ہے گویا نصرتؔ چوہدری نے ”HAVE & HAVE NOT“ کے خوش کُن اور حیران کُن تصوّر کو شعر کے قالب میں سمو دیا ہے اس ضمن میں درج ذیل شعر بھی مقالے کی موضوعیّت کو تقویت دینے کے لئے کافی ہے۔

” العاقل تکفیۃ الاشارۃ“ (عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہے)

ﮯ اُٹھی ہے شام دھوپ کا سونا سمیٹنے
سورج کے پاس بھی تو یہ دولت پرائی تھی

اوران تجربوں اور بشارتوں کے بعد شاعر کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار غالباً

نظر نہیں آتا "سپردم بتو مایۂ خویش را" پر عمل کرتے ہوئے گوشۂ عافیت میں معتکف ہو کر کچھ دیر اس طرح آرام کرے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے

کاغذ کی کشتی کو چھوڑ کے پانی میں　　لہروں کی شاخوں کو ہلاتا رہتا ہوں
پاگل ہو کر ذہن کی اندھی گلیوں میں　　چاند کو اپنے پاس بلاتا رہتا ہوں

لیکن شاعر سماج کی نااہلی، عدم انقلابیت، رجعت پسندی اور فن کار فراموشی سے مایوس نہیں ہوا۔ نصرت چوہدری بدستور للکار رہا ہے۔ اُس کے الفاظ کی گھن گرج سے سماعتیں سہمی ہوئی ہیں، وہ پے در پے وار کرنا چاہتا ہے۔ معاشرے سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے لیکن اس کی انانیت "EGOISM" یا "EGOTISM" کسی خود دار اور انا بردار سہارے کی متلاشی ہے جیسے کہ وہ خود کہتا ہے:

ے　پیار کے لہجے میں دو ملکی سی اک آواز تم　　زندگی کا لوٹ کے آنا کوئی مشکل نہیں

ان مباحث کے بعد مجھے نصرت چوہدری صاحب کے اسلوب اور "DICTION" کے بارے میں مختصراً کچھ کہنا چاہیئے۔ جہاں تک زبان کا معاملہ ہے میں ان متعصب اور محدود الفکر اردو پرستوں میں سے نہیں ہوں جو زبان کی قدیم اقدار کے حامل ہوں۔ زبان اسی وقت ارتقا پاتی ہے جب اس میں اختراع اور اجتہاد کیا جائے۔ ان اختراعی کوششوں کے دوران "تجریدیت" "ABSTACTISM" کا آنا لازمی ہے لیکن تجریدیت کا یہ مفہوم نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ "تجسیم" سے کوسوں دور نکل جائے اور سامع ہمارا منہ تکتا رہ جائے۔ اس ضمن میں مجھے بھی کچھ تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا اور ہر طرف سے تنقید کے وار سہنے پڑے۔ ہر چند کہ میں نے "تجرید" کا کبھی سہارا نہیں لیا۔ لیکن فارسی اور عربی کے امتزاج سے پیدا شدہ تراکیب کے غلبے کی وجہ سے قاری کو کئی صورتوں میں مایوس ہونا پڑا اور مجھے دوبارہ اور سہ بارہ اپنی تخلیقی مساعی سے بھاری بھرکم "DICTION" کے لبادے اتارنے پڑے۔ ہر چند کہ برادرم نصرت چوہدری نے بھی شعوری طور پر

کوشش کی ہے کہ وہ اپنی جدید تراکیب سے " IMAGE " پیدا کریں۔ اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن ہم کو تلازماتِ شعری کی روایتی اقدار کا بالکل بائیکاٹ نہیں کر دینا چاہیئے۔

"نصرتؔ چوہدری" نے بہت خوبصورت شعر کہے ہیں اور بھرپور انداز میں کہے ہیں ان کے ہاں عجزِ بیان نظر نہیں آتا تاہم انہیں خود کو اور قاری کو "بحرِ تجرید" میں اس قدر غرق نہیں کر لینا چاہیئے کہ وہاں سے دونوں کی بازیابی مشکل ہو جائے۔ یہ صرف نصرتؔ چوہدری ہی کے لئے مشورہ نہیں بلکہ عصرِ حاضر کے تمام شعراء سے میری درخواست ہے۔ ایک اور خصوصیت جو نصرتؔ چوہدری صاحب کے کلام سے ظاہر ہے وہ ان کا منفرد سٹائل ہے۔ اسلوب کی چھاپ پیدا کر لینا ہی فن کاری ہے۔ اور اس چھاپ کو پیدا کرنے میں عرصہ لگتا ہے۔ غالباً کچھ دنوں بعد نصرتؔ چوہدری اپنے اس اسلوب کو کسی اور اُفق سے نکھار سنوار کر سامنے لا سکیں گے۔ کیونکہ فن کار کے یہاں فنی قناعت، زہرِ قاتل کے مترادف ہے ـــ بقول: نصرتؔ چوہدری

؎ تیرے بدن کو دیکھ کے کہتا ہوں جو غزل
دو دن کے بعد وہ بھی پرانی دکھائی دے

○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زینۂ صدا کا مسافر

انسانی صدا ہی انسان کی سب سے بڑی پہچان ہے. صدا نے لفظوں کو جنم دیا اور لفظوں نے تحریر کو. چیخ سے قہقہے تک اور آہ سے واہ تک ان گنت جذبوں کی صدائیں لفظوں کو جنم دیتی رہیں. لفظ اور صدا کے کتنے ہی رنگ اور زاویے انسان کی پہچان اور تعارف کا وسیلہ بنے. کبھی تو احساس کی بھٹی سے لفظ اور صدائیں ڈھلیں اور کبھی لفظوں کی صدا سے احساس اور جذبے بیدار ہوئے. اور پھر جب کبھی آدمی کے اندر کی انسانیت سو گئی یا مر گئی تو لفظوں اور جذبوں کا رشتہ بھی اسی تناسب سے پھیکا پڑ گیا. لفظوں کو انسان نے اپنی پہچان کے لئے تخلیق تو کر لیا لیکن جب اس کی انسانیت کمزور پڑ گئی تو انہی لفظوں نے انسان کے گرد حصار کھینچ دیا اور پھر یہی لفظ انسان کی پہچان گم کرنے کے کام میں آنے لگے. آج کا انسان جہاں ٹیکنالوجی کے حصار میں گم ہے وہاں لفظوں کی یلغار سے بھی حواس باختہ ہے.

نصرت چوہدری لفظ و آہنگ اور احساسات و جذبات کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑ کر انسان کو ابھارنے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے. لفظوں کی گرد سے اٹے ہوئے چہروں کو وہ لفظوں ہی کے پانی سے دھوتا ہے اور صداؤں کے بھنور میں پھنسے ہوئے انسان کو وہ صدا ہی کی رو بچاؤ کشتی (Life boat) کے ذریعہ بچانے کا جتن کرتا ہے. اس کی شاعری میں لفظ اور جذبے کا ملاپ انسان کی اکائی کی صورت میں ابھرتا ہے. لفظ اور صدا اس کی شاعری کے بنیادی استعارے ہیں اور نصرت کی شاعری میں ان علامتوں کے اتنے ہی روپ ہیں جتنے خود انسان کے. اس سلسلے میں چند اشعار دیکھئے.

؎ لب کھول کر صدا کے سمندر میں کود جا
کب تک رہے گا لپٹا ہوا بادبان سے

؎ لفظوں کی تھالی میں ہم تو آنکھیں رکھ کر لائے ہیں
ان لوگوں سے بات کرو جو ان کے اندر بیٹھے ہیں

؎ اگر جلتی ہوئی دیکھو کہیں لفظوں کی قندیلیں،
وہاں جاؤ تو پھر محکم یقیں سے روشنی لاؤ،

؎ اس دور میں تو یوں بھی اُجالے کٹے گئے
الفاظ پتھروں کے حوالے کئے گئے

؎ لفظوں سے گفتگو کو سجا کر نہ پیش کر
دے کر حدیثِ دل کا حوالہ دکھا مجھے،

ملاپ کی خواہش میں زینۂ صدا پر مسلسل سفر کرنے والا نصرت چودھری بظاہر فراق سے زیادہ وصال کی لذتوں کا شاعر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ اس کے ہاں ہجر کی کیفیتیں بھی ہیں لیکن کچھ یوں کہ وہ چیخیں بلند نہیں کرتا۔ اس کے فراق میں بھی وصال کی لذّت اور سرور ہے۔ اور یہ کیفیت اس کی شاعری میں صرف کہنے کی حد تک نہیں بلکہ اس کے احساسات کا خمیر ہی عشق و محبت کی لطافت سے اُٹھا ہے۔ یہ لطافت جب ایک بار دل کی دھڑکنوں میں بس جائے تو اس کی کوملتا اور نرمی فراق کے کڑے سے کڑے لمحات میں بھی کھردراپن نہیں آنے دیتی۔ نصرت کی شاعری جذبۂ محبت میں ڈوب کر اُبھری ہے۔ اس لئے اس کے ہاں فراق اور ہجر کی کیفیت بھی وصال کے سرور میں بھیگ کر آتی ہے۔ ؎

صدا کی لہر تڑپتی ہے دل کے دریا میں تمہاری یاد کی کشتی کدھر سے گزری ہے
ہوا نے گیت جو لکھے شجر کے پتوں پر خزاں انہی کو لئے اب شجر سے اتری ہے

★

ے کیوں مجھے بھیگی ہوئی آواز آتی ہے تری
میں ترے پہلو سے کب اٹھا ہوں چشم تر لئے،

ے سوچوں کی قبروں پر بٹھا رات گئے | میں لفظوں کے دیپ جلاتا رہتا ہوں

ے اڑتے نہیں غموں کے کبوتر مکان سے | لفظوں کے تیر پھینک لبوں کی کمان سے

ان اشعار میں بھی لفظ اور صدا کی علامتیں قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ان دو علامتوں کو نصرت چودھری نے جدید تر، توانا، صحت مند اور تازگی کا احساس لیے ہوئے اتنے مختلف النوع معانی دیئے ہیں کہ اس کی انفرادیت کو آسانی سے نہیں جھٹلایا جا سکتا۔ اسی کا ایک شعر سنا کر میں قارئین اور نصرت چودھری کے درمیان سے پرے ہوتا ہوں۔

ے حدود جسم میں سمٹی ہوئی ادا کی طرح
تو ایک لفظ ہے لیکن کتاب لگتا ہے

ریاض احمد شاد

ریاض احمد شاد

گورنمنٹ کالج سرگودھا

۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۶ء

بج رہی ہیں سوچ کی یوں گھنٹیاں اذہان میں
سیٹیاں جیسے بجاتی ہے ہوا طوفان میں

جتنی تصویریں بنیں تیرے پیار کی سکرین پر،
جل رہی ہیں اب وہ میرے دل کے آتشدان میں

تو کہے تو آج میں تیرے بدن کے پھول کو
رات بھر رکھوں سجا کر آنکھ کے گلدان میں

ریت کی چادر بچھائے پیار کے صحرا کی آنکھ
منتظر ہے حسن کے بادل کی ریگستان میں

میں کھڑا ہوں خوف کے جنگل میں جس کا منتظر
وہ کھڑی ہے سوچ کی چادر لئے دالان میں

○

زیرِ نقاب وہ کسی خنجر سے کم نہ تھا
مِل کر بچھڑنا موت کے منظر سے کم نہ تھا

لفظوں کے پتھّروں سے تراشا ہوا بدن
شوکیس میں پڑا کسی پیکر سے کم نہ تھا

طغیانیوں کو دیکھ کے بادل بھی رو پڑے
دریا کا جوش بھی تو سمندر سے کم نہ تھا

ملتی نہیں جس جگہ وہ پری زادیاں مجھے
پیپل کا وہ شجر کسی مندر سے کم نہ تھا

دیکھا جو میں نے غور سے چشمہ اتار کر
باہر کا فاصلہ بھی تو اندر سے کم نہ تھا

اس بات کا تو ہر جگہ چرچا تھا شہر میں
نصرتؔ ولی نہیں تو قلندر سے کم نہ تھا

○

بادل گرج رہے تھے ہوا لڑکھڑائی تھی،
شاید کوئی کرن میرے کمرے میں آئی تھی

اُٹھی ہے شام دھوپ کا سونا سمیٹنے
سورج کے پاس بھی تو یہ دولت پرائی تھی

شرما کے چاند چھپ گیا بادل کی اوٹ میں
جس وقت میرے ہاتھ میں تیری کلائی تھی

اُڑنے لگے تھے ٹوٹ کے تارے فضاؤں میں
جب آئینے کے سامنے تُو مسکرائی تھی

نکلا تھا چاند شب کے دریچے کو کھول کر
وشتِ ہوا نے یا تیری چلمن ہٹائی تھی

○

○

بامِ اُفق پہ جلوہ نما تُو نہ ہو کہیں
یہ چاند بھی تیرا خمِ ابرو نہ ہو کہیں

پانی اُچھل اُچھل کے جسے دیکھنے لگا،
وہ زینتِ نقابِ لبِ جو نہ ہو کہیں،

آئی ہے رات دوش پہ کیوں چاندنی لئے
عریاں کسی جگہ تیرا بازو نہ ہو کہیں

مستی میں آ رہے ہیں کٹورے گلاب کے
یہ بھی تمہاری آنکھ کا جادو نہ ہو کہیں

بیٹھی ہے چھپ کے پھول کی پتّی میں جو صدا
نصرتؔ کسی بدن کی وہ خوشبو نہ ہو کہیں،

○

○

اُڑتے نہیں غموں کے کبوتر مکان سے
لفظوں کے تیر پھینک لبوں کی کمان سے

فن کار ہے تو فن کے اُجالے خرید لے
اُتری ہے روشنی کی کرن آسمان سے

لب کھول کر صدا کے سمندر میں گونج جا
کب تک رہے گا لپٹا ہوا بادبان سے

پھر اُٹھ سکی نہ جسم کی دیوار دوستو
سایہ سا اِک نکل کے گیا تھا مکان سے

کس کے لہو کی نہر میں دھویا گیا اسے
آتی ہے باس خون کی کپڑے کے تھان سے

جو کچھ ہوا ہے دل کی حویلی میں میرے ساتھ
اُترا ہے بن کے شعر وہ میری زبان سے

○

ستاروں نے ڈوب کر بھی وفا کا صلہ دیا
سورج کا پھول شاخِ افق پر کھلا دیا

ساحل پہ میرے نام کی تختی کو دیکھ کر
پانی میں تیرنے لگا جلتا ہوا دیا

حیرت سے دیکھنے لگیں آنکھیں زمین کی
کالی گھٹا نے جب بھی کوئی فیصلہ دیا

دیوار بن کے خود تو ہوائیں کھڑے رہے
سایہ سمجھ کے مجھ کو زمیں پر گرا دیا

میں زندگی سے لڑتا رہوں فاتحانہ جنگ
اتنا بھی کب کسی نے مجھے حوصلہ دیا

نصرتؔ تو زندگی کے اُجالے خرید لے
سوچوں نے جب دیا ہے یہی مشورہ دیا

○

○

بھیگی بھیگی آنکھیں لیکر زانوئے شب پر بیٹھے ہیں
جُرم میری سوچوں کے پنچھی جانے کیا کر بیٹھے ہیں

جن کی خاطر گلی گلی میں پاگل ہو کر پھرتا ہوں،
میں نے سنا ہے وہ ہمسائے اب تو مرے گھر بیٹھے ہیں

کل تک جن کی عظمت کی تاریخ گواہی دیتی تھی
طاقت سے سمجھوتہ کرنے آج وہی سر بیٹھے ہیں،

لفظوں کی تھالی میں ہم تو آنکھیں رکھکر لائے ہیں
اُن لوگوں سے بات کرو جو ان کے اندر بیٹھے ہیں،

لمحوں کی دہلیز پہ بیٹھی سوچ رہی ہے خلقت کیا
کس کی بربادی کا قصّہ چھیڑ کے افسر بیٹھے ہیں

○

ڈور سرخی کی جو تیری مدبھری آنکھوں میں تھی
پھیل کر اُتری ہوئی شاید وہی شیشوں میں تھی

کس طرح آ کر پڑیں پرچھائیاں دیوار پر
ایک ہی لڑکی تھی لیکن مختلف شکلوں میں تھی

تم نے دروازے پہ آ کر نام پوچھا تھا مرا،
یا صدا کی گونج کوئی بھاگتے لمحوں میں تھی

کون آیا تھا مرے پہلو میں لمحے کی طرح،
کس کی خوشبوئے بدن اب تک مرے سپنوں میں تھی

ٹوٹ کر دوشِ ہوا پر اڑتے پتّوں کی طرح
زندگی بکھری ہوئی نصرتؔ مری غزلوں میں تھی

○

گلدان سے جب مجھ کو تیری باس نہ آئی،
مجھ کو میرے کمرے کی ہوا راس نہ آئی

میں کھول کے بیٹھا رہا آنکھوں کے دریچے
پھر بھی تری تصویر مرے پاس نہ آئی

ہونٹوں کی فصیلوں پہ بھی میں دیپ جلاتا
افسوس کہ وہ غیرتِ الماس نہ آئی

لفظوں کو اجالوں کا لہو پینا پڑے گا
ذہنوں میں اگر گرمئی احساس نہ آئی

تیروں کی طرح اس پہ برسنے لگی کرنیں
جب خیمۂ شبنم میں ہری گھاس نہ آئی

اُس آنکھ میں اک ایسی بھی تحریر تھی نصرتؔ
جس میں ابھی رنگینیٔ قرطاس نہ آئی

○

○

لوریاں بکھیرے دیکھ طوفاں نہ بن وہ سماں اور تھا یہ سماں اور ہے
ناچ سنگیت پر رقص خنجر نہ کر وہ جہاں اور تھا یہ جہاں اور ہے

گیت کے بول ہیں پیار کے مرحلے تیرے مہکے ہوئے گیسوؤں کے تلے
رو پڑیں دیکھ کر یہ بہاریں جسے وہ نشاں اور تھا یہ نشاں اور ہے

تیری آنکھوں میں مستی ہے کس چیز کی یہ لہو بھی نہیں، یہ نشہ بھی نہیں
میں نے دیکھی تھیں پہلے بھی یہ سُرخیاں وہ گماں اور تھا یہ گماں اور ہے

بات سچی نہیں کس طرح مان لوں جھوٹ ہے یہ اگر تو اِسے جان لوں،
یاد ہے مجھ کو کل جو کہا آپ نے وہ بیاں اور تھا یہ بیاں اور ہے

یہ گلی بھی وہی یہ مکیں بھی وہی یہ مکاں وہ نہیں یہ مکیں وہ نہیں
جس کی کھڑکی کھلی تھی مجھے دیکھ کر وہ مکاں اور تھا یہ مکاں اور ہے

میرا نصرت نہیں کوئی پاگل ہے یہ رہگذاروں پہ آوارہ بادل ہے یہ
میری خاطر اُڑا تھا جو بن کے دھواں وہ دھواں اور تھا یہ دھواں اور ہے

○

چُوم کر جب تیری زلفوں کو ہوا آئی ہے
دل کے صحرا پہ برسنے کو گھٹا آئی ہے

کس نے یہ قصرِ تمنّا کے دریچے کھولے
کیوں مرے کانپتے ہونٹوں پہ صدا آئی ہے

دشتِ احساس سے اٹھّی ہے وفا کی آندھی
جب مرے سامنے وہ جانِ حیا آئی ہے،

دوستو رات کے بستر سے اٹھا نے مجھ کو
پھر سحر اوڑھ کے کرنوں کی قبا آئی ہے

جب بھی پھوٹی ہے ترے پیار کے سورج کی کرن
وقت کو رات کے زانو پہ سُلا آئی ہے

○

○

تو دیکھنے میں مہکتا گلاب لگتا ہے
تیرا بدن مجھے جامِ شراب لگتا ہے

میں سوچتا ہوں کہ کیا نام دوں تجھے آخر
کبھی تو چاند کبھی آفتاب لگتا ہے

حدودِ جسم میں سمٹی ہوئی ادا کی طرح
تو ایک لفظ ہے لیکن کتاب لگتا ہے

نشے میں آ کے جوانی کا ہاتھ چہرے سے
ہٹا رہا ہے حیا کی نقاب لگتا ہے

گذر رہا ہے جو دیکھے بغیر دن تجھ کو
مجھے وہ دن میرا یومِ حساب لگتا ہے

○

○

جہاں اُگتی ہیں سوچیں اُس زمیں سے روشنی لاؤ
دماغوں کے لئے جا کر کہیں سے روشنی لاؤ

گھُٹا جاتا ہے دم میرا نمائش کے اندھیرے میں
میری خاطر کسی پردہ نشیں سے روشنی لاؤ

جہاں انسانیت کا درس دیتی ہو یہ خاموشی
میرا یہ مشورہ ہے تم وہیں سے روشنی لاؤ

اگر جلتی ہوئی دیکھو کہیں لفظوں کی قندیلیں
وہاں جاؤ تو پھر محکم یقیں سے روشنی لاؤ

اُٹھو نوکِ قلم سے رہگذاروں کا بدن چیرو
چمکتی آبشاروں کی جبیں سے روشنی لاؤ

جو ٹکڑے مانگ کر کھائے وہ شاعر ہی نہیں نصرتؔ
غزل کے واسطے بنجر زمیں سے روشنی لاؤ

○

○

لفظوں کی گونج سوچ کی جھنکار گر پڑی
پتّے اُٹھے تو شاخ کی تلوار گر پڑی

دن بھر تمام شہر میں ماتم کیا گیا
شاید امیرِ شہر کی دستار گر پڑی

آنکھوں میں تیرتی ہوئی میرے لہو کی بوند
میں روکتا رہا سرِ بازار گر پڑی

اس زور سے خیال کا پتھر لگا مجھے
حیران ہو کے وقت کی رفتار گر پڑی

آ کر گرا ہے اوس کا قطرہ گلاب پر
پانی کی بوند یا سرِ رخسار گر پڑی

احباب کے سلوک سے تنگ آ کے ایک دن
نصرتؔ میرے خلوص کی دیوار گر پڑی

○

○

دیکھ کر وہ میرے چہرے کی نشانی رویا
آنکھ کی جھیل میں ٹھہرا ہوا پانی رویا

دن کے خورشید کو فرصت ہی کہاں تھی اتنی
رات کا چاند مری سُن کے کہانی رویا

زلف کے پھول سے جب اوس کے قطرے اترے
یہ سماں دیکھ کے کیوں سازِ جوانی رویا

آ گیا جب اُسے اس پیاس کی شدت کا خیال
جو دھواں بن کے اُڑا تھا وہی پانی رویا

گھر کی دہلیز پہ بیٹھے ہوئے بچے کی طرح
میں تری دیکھ کے تصویر پرانی رویا

○

○

نقاب اُٹھے تو خنجر کی ادا آواز دیتی ہے
کھنک اُٹھتے ہیں ساغر جب گھٹا آواز دیتی ہے

پرندوں کی طرح شاخوں سے پتّے اُڑنے لگتے ہیں
انہیں جس وقت یہ پاگل ہوا آواز دیتی ہے

میرے ہونٹوں پہ اک کافر تمنّا تیر جاتی ہے
کسی کو جب کوئی جانِ حیا آواز دیتی ہے

مجھے لفظوں کی چادر سے لہو کی باس کیوں آئی
میرے قاتل کو شاید پھر خدا آواز دیتی ہے

میں اکثر سوچتا ہوں تجھ سے میرا کیا تعلق ہے
تو جب مجھ سے بچھڑتا ہے قضا آواز دیتی ہے

اُتر آتے ہیں دیواروں سے جلتی شام کے سائے
یہ سننے کے لئے نصرتؔ وہ کیا آواز دیتی ہے

○

○

پیار کی گلیوں سے اُٹھ کر داستاں تک آ گئے
دل کے ٹکڑے ٹوٹ کر آخر زباں تک آ گئے

تب ہوا اے دوستو احساسِ تنہائی مجھے
گردشوں کے ہاتھ جب میرے مکاں تک آ گئے

طور کی چوٹی سے آخر کیا کہا انسان نے
آگ کے شعلے کہاں تھے اور کہاں تک آ گئے

زخم کھا کر کیا پرندے نے وصیّت کی انہیں
کس طرح ٹوٹے ہوئے پر آشیاں تک آ گئے

اُٹھتے اٹھتے رہ گئے تھے رات جو ساغر پہ ہاتھ
انتقاماً آج وہ پیرِ مغاں تک آ گئے

سوچ کی کشتی میں نصرتؔ بیٹھ کر اہلِ قلم
پانیوں سے پوچھتے ہیں ہم کہاں تک آ گئے

○

خوف کی زنجیر میری سوچ کے پاؤں میں تھی
پھر بھی طغیانی بہت لفظوں کے دریاؤں میں تھی

گردشِ حالات نے گو سی دیئے تھے لب میرے
باوجود اس کے مری شہرت شناساؤں میں تھی

جھوٹ کی دیوار کانپ اٹھی تھی میرے نام سے
میری شخصیت کی اتنی دھوم آقاؤں میں تھی،

مانگتی تھی رات دن میری حفاظت کی دعا
میری بوڑھی والدہ جو منتظر گاؤں میں تھی

زیست کو پالا تھا آغوشِ لہو میں دھوپ نے
اس لئے نالاں وہ تیرے شہر کی چھاؤں میں تھی

○

مجھکو اندیشہ ہے ہم کو یہ سزا دی جائے گی،
کر کے سازش آخری مشعل بجھا دی جائے گی

پتّے پتّے کو سپردِ خاک کرنے کے لئے
نفرتوں کی آگ ہر جانب لگا دی جائے گی

آگ کے شعلوں کی حدت تیز کرنے کے لئے
دامنِ تقریر سے اُن کو ہوا دی جائے گی

جرأت اظہار پر پہرے بٹھائے جائیں گے
جو صدا اُٹھی وہ سولی پر چڑھا دی جائے گی

صورتِ سیلاب اُٹھنے کا زمانہ آگیا
ایک دو اُٹھے اگر گولی چلا دی جائے گی

○

جدھر جدھر بھی گیا میں زباں پہ پہرے تھے
قفس تو تھا ہی قفس آشیاں پہ پہرے تھے

قلم کی نوک پہ الفاظ کے دریچوں پر
خیال و فکر کے سارے مکاں پہ پہرے تھے

جہاں جہاں سے بھی گزرا ہے کاروانِ خیال
پتہ چلا ہے کہ ہر آستاں پہ پہرے تھے

فضا میں پھیل کے آواز لوٹ آئی ہے
زمیں کا ذکر ہی کیا آسماں پہ پہرے تھے

کلی کلی کے لبوں پہ تھی مہر خاموشی
میں جا سکا نہ وہاں گلستاں پہ پہرے تھے

ہیں تیرے شہر کی گلیاں بھی خوف کی زد میں
میں جس طرف بھی گیا ہر مکاں پہ پہرے تھے

میرے خلوص کی توہین اور کیا ہو گی،
کہ میرے گھر میں بھی میری زباں پہ پہرے تھے

○

○

آج پھر ساز کے تاروں نے غزل چھیڑی ہے
دیکھ شرما کے بہاروں نے غزل چھیڑی ہے

رقص ہے رات کے آنگن میں پری زادوں کا
چاند نے گیت ستاروں نے غزل چھیڑی ہے

ساقیا چومنے دے زلف کے بادل مجھ کو
جھوم کر پھر مرے یاروں نے غزل چھیڑی ہے

اب تو کچھ تم بھی مری جان سناؤ نغمہ
ساغرِ مے کے کناروں نے غزل چھیڑی ہے

سوچ کی دھوپ میں پھر سو گیا نصرتؔ کوئی
کیوں مرے دل میں شراروں نے غزل چھیڑی ہے

○

○

قطرے کی آرزو تھی تو دریا دیا مجھے
مانگی زمینِ شہر تو صحرا دیا مجھے

کس نے لہو کو نور کے سانچے میں ڈھال کر
اُٹھ کر فضا کے کھیت میں پھیلا دیا مجھے

مانگی جو میں نے زلف کے سائے کی اس سے بھیک
صدیوں کی تیز دھوپ میں ٹھہرا دیا مجھے

پیچھا کریں نہ دیکھ تیرا اس گلی کے لوگ،
آنچل کی اوٹ ہی سے یہ سمجھا دیا مجھے

وعدے کی رات ایک بھی پل سو سکا نہ میں
نصرت کسی نے آج بھی دھوکا دیا مجھے

○

○

چاند نکلا ہے میرے آنگن میں آدھی رات کو
زلف کے جنگل صدا دینے لگے برسات کو

ہر طرف کمرے میں برقی پھول روشن ہو گئے
اک گلابی ہونٹ نے چوما تھا میرے ہاتھ کو

رات محفل میں میرے ساغر نے جب انگڑائی لی
کر دیا زنجیر اس نے گردشِ حالات کو

چاند کی غاروں میں اس کا دل بہل سکتا نہیں
تو وہاں لے کر نہ جا دھرتی کی اس سوغات کو

سوچتا ہوں آج میں لفظوں کے شیشے جوڑ کر
آئینہ نصرتؔ دکھاؤں کیوں نہ کالی رات کو

○

○

دھرتی کا خون سُرخ گلابوں میں دیکھئے
چہرے چھُپے ہوئے ہیں نقابوں میں دیکھئے

کتنا عظیم ہے کسی فنکار کا وجود
یہ فیصلہ ادب کی کتابوں میں دیکھئے

ایسا نہ ہو کہ جسم کا خیمہ بھی گر پڑے
رکنے لگی ہے سانس طنابوں میں دیکھئے

پانی کے ساتھ کونسا رشتہ ہوا کا ہے
کیوں ہو گئی اسیر حبابوں میں دیکھئے

دیکھا تھا ایک دن ترا گورا بدن کہیں
سورج پگھل گیا مرے خوابوں میں دیکھئے

نصرتؔ مرے پڑوس میں ہر روز شام کو
اِک پھُول تیرتا ہے شرابوں میں دیکھئے

○

○

بھیگی ہوئی ہے رات بھی زلفوں کی شال کی طرح
لفظوں کے پیرہن میں آ حُسنِ خیال کی طرح

تیشۂ لب سے توڑ دے پتھر کے اس خدا کا سر
میرے بدن پہ رقص کر شامِ وصال کی طرح

کرنوں کی ڈور تھام کے زینۂ شب پہ چل کے دیکھ
اُڑنے لگیں گے راستے گردِ ملال کی طرح

کالی عبا کو اوڑھ کے بیٹھا ہے سنگِ میل پر
کاسہ بدست کون یہ حرفِ سوال کی طرح

یارو کسی کے سوگ میں تڑپے نہ کوئی زندگی
اس میں تو ایک رات ہی کٹتی ہے سال کی طرح

میرے لہو کی جھیل میں غوطہ لگا کے دیکھیے
فن کے کنول کھلے ہوئے عکسِ جمال کی طرح

○

تمہاری گود میں یہ پھول کتنا پیارا لگے
مجھے تو چاند کے نزدیک ایک تارا لگے

وہ سُرخ ہونٹ تو دیوار تھے تبسّم کی
مجھے جو خُون میں ڈوبا ہوا کنارا لگے

میں انقلاب کی لہروں پہ اک سفینہ تھا
مجھے تو تیرِ قضا کے بھی اک سہارا لگے

وہ اک کرن ہے کسی نور میں نہائی ہوئی
مجھے جو بہتا ہوا آنسوؤں کا دھارا لگے

لہو کی شاخ پہ افسردگی کا پھُول ہے تُو
ترا کلام کیوں نصرتؔ نہ سب کو پیارا لگے

سورج کا پھول کھل کے دکھائی تو دے کبھی
مجھکو حصارِ شب سے رہائی تو دے کبھی

جس کے لئے ہیں پیاس کے جنگل صلیب پر
بادل کی وہ صدا ہی سنائی تو دے کبھی

پتھرا کے رگر پڑیں میری آنکھیں زمین پر
ایسی بھی ایک ضربِ جدائی تو دے کبھی

پانی میں تیر جائیں گی پھولوں کی کشتیاں
تو دستِ گل میں اپنی کلائی تو دے کبھی

ابرِ کرم کو جوش میں لانے کے واسطے
نصرتؔ غموں کی اُٹھ کے دہائی تو دے کبھی

○

خون دے دیکر اگر لفظوں کو پالا جائے گا
تب کہیں تاریک ذہنوں کو اُجالا جائے گا

تیشۂ فن سے یہ آوازوں کے پتھر توڑ کر
سوچ کی تہ سے کوئی چشمہ نکالا جائے گا

دیر تک موجیں اُسے پانی میں رکھ سکتی نہیں
وہ اگر موتی ہے تو اُس کو اچھالا جائے گا

میں تو سورج ہوں بکھر جاؤں گا تاروں کی طرح
مجھکو کیسے رات کے زنداں میں ڈالا جائے گا

جدتِ فن کی اگر تاریخ لکھی جائے گی
تیرے نصرتؔ کا دیا اس میں حوالہ جائے گا

○

○

لے سوچ کے پنچھی میرے الفاظ میں ڈھل جا
تو خاک کا ذرّہ ہے تو سورج میں بدل جا

جس شہر میں تہذیب کی دیوار گری ہے
اُس شہر سے اُٹھ کر تو کہیں دور نکل جا

کھیتوں میں تشدّد کا میں منظر تو نہ دیکھوں
اے برف کے ٹکڑے میری آنکھوں میں پگھل جا

جس آگ میں جلتے ہیں دماغوں کے پیالے
اے نوکِ قلم تو بھی اسی آگ میں جل جا

حالات کے ہاتھوں میں ہیں طوفان کی نبضیں
دیوار کے شیشے سے کہو اب تو سنبھل جا

نصرتؔ کو ترے پیار کی فرصت ہی کہاں ہے
آیا ہوا تقدیر کے ماتھے پہ نہ ہے ۔ بل، جا

○

شراب پینے سے پہلے ہی لڑکھڑانا پڑا
کسی کی آنکھ کی جھیلوں میں ڈوب جانا پڑا

خفا ہوا جو کوئی سوچ کے تصادم پر
وہاں پہ مجھکو نیا واقعہ سنانا پڑا

دبا نہ ساتھ جو پتوں نے بھی بلوغت تک
کلی کو وقت سے پہلے ہی مسکرانا پڑا

پڑیں جو رُخ پہ وہ زلفیں تو دھوپ شرمائی
نکل کے ابر سے سورج کو لوٹ جانا پڑا

وہیں وہیں پہ اُگے ہیں درخت سوچوں کے
جہاں جہاں پہ مرے آنسوؤں کا دانہ پڑا

○

جب لہریئے نقاب کی آواز آئے گی
کھلتے ہوئے گلاب کی آواز آئے گی

لفظوں کو میں نے سوچ کے چھینٹے دیئے اگر
ہر لفظ سے کتاب کی آواز آئے گی

جب تجزیہ کرو کے مشینوں کے شور کا
کھیتوں سے انقلاب کی آواز آئے گی

جزوِ بدن بنے گی کہیں پر کوئی کرن
کانوں میں آفتاب کی آواز آئے گی

نصرت کسی کے جسم کی شاخوں کو دیکھ کر
آنکھوں سے بھی شراب کی آواز آئے گی

○

○

آنسوؤں کی بوند ہے ٹھہری ہوئی رخسار پر
یا کوئی قندیل رکھی ہے کسی دیوار پر

دیکھ کر کلیوں کے ماتھے پر پسینہ آ گیا،
پھول کو تولا گیا جب شاخ کی تلوار پر

چاند کا خنجر گرا ہے آنکھ کے تالاب میں
یا کوئی تصویر آئی ہے درِ افکار پر

ذہن کی گلیوں میں یادیں یوں ترنم ریز ہیں
چہچہاتے ہیں پرندے جس طرح اشجار پر

ریت کے ٹیلے پہ بیٹھا گیت گاتا ہے کوئی
پھول دستک دے رہا ہے یا درِ گلزار پر

مجھکو تنہائی کی کالی جھیل سے موتی ملے
لوگ بھاگے جا رہے ہیں زینۂ رفتار پر

○

○

وہ دے کے بادلوں کی صدا جھومنے لگی
زلفیں کھلیں تو کالی گھٹا جھومنے لگی

یہ کس کا عکس آنکھ کے ساغر میں آگیا
یہ کس کو دیکھتے ہی وفا جھومنے لگی

شبنم کی بوند برگِ گلِ تر پہ دیکھ کر
بستر کے ہر شکن میں حیا جھومنے لگی

شاید کسی نے پیار کے آنچل کو چھو لیا
اٹھیں وہ انگلیاں تو حنا چومنے لگی،

کچھ تو کیا ہے اُٹھ کے دھوئیں کی لکیر نے
کیا سُن کے جنگلوں کی ہوا جھومنے لگی

نصرتؔ کسی کے ہاتھ میں بوتل کو دیکھ کر
گرنے لگا تو لغزشِ پا جھومنے لگی،

○

اس دور میں تو یوں بھی اُجالے کئے گئے
الفاظ پتھروں کے حوالے کئے گئے

لفظوں کے سبز باغ دکھا کر عوام کو
رہبر کی غلطیوں کے ازالے کئے گئے

اس سے بھڑک اٹھے گی بغاوت کی آگ بھی
ہونٹوں کے روبرو جو یہ تالے کئے گئے،

مرنے لگا تھا پیاس کی شدّت سے دشتِ تھل
چھلنی وہاں پہ پاؤں کے چھالے کئے گئے

نصرتؔ کتابِ زیست مکمل نہ ہو سکی،
اوراقِ زندگی یونہی کالے کئے گئے

○

کتنے گھر پھونکے گئے ہیں اک گھرانے کیلئے
آسماں پر چاند میں نگری بسانے کے لئے

لے رہا ہے وقت شاید ارتقائی کروٹیں
بستیاں بے تاب ہیں شہروں میں آنے کیلئے

دیکھئے تو آرہا ہے اک مسلسل انقلاب
سوچئے تو ہر تعلق ٹوٹ جانے کے لئے

کچھ نئی قدریں پرانی سیڑھیوں پر خندہ زن
کچھ پرانے فلسفے اگلے زمانے کے لئے

آج ہر پتہ ہے خوں کی شاخ سے ٹوٹا ہوا
آج ہر تنکا پریشاں آشیانے کے لئے

○

○

لہو کی جھیل میں مست شاخِ گل اتار مجھے
خزاں نصیب ہوں دے مژدۂ بہار مجھے

گِرا ہوا ہوں میں حالات کی چٹانوں میں
پکارتا ہے کوئی پربتوں کے پار مجھے

کِھلے ہیں دیکھ کے مجھ کو جو صحنِ گلشن میں
یہ پھول بھی نظر آتے ہیں اب تو خوار مجھے

سفید جھوٹ کی دیوار ٹوٹ جائے گی
ملے گا کھویا ہوا پھر مرا وقار مجھے

خدا کی ذات پہ نصرت بڑا بھروسہ ہے
خوشی وہ دے گا مگر دے گا قسط وار مجھے

○

○

دیکھا اُسے تو کیوں مری تقدیر رو پڑی
حیران جو کھڑی تھی وہ تفسیر رو پڑی،

سچ بولنے کے جرم میں مجھ کو صلیب پر
لایا گیا تو پاؤں کی زنجیر رو پڑی

محرابِ شب پہ دیکھ کے سورج خیال کا
لفظوں کی آنکھ سوچ کی تنویر رو پڑی

کمرے میں دیر تک مجھے چپ چاپ دیکھ کر
گلدان رو پڑا تری تصویر رو پڑی

اپنے لہو میں تیر گیا جب مرا وجود
اک گلبدن کے ہاتھ میں شمشیر رو پڑی

○

○

دیا بجھنے لگا ہے آنکھ تر ہونے سے پہلے ہی
شبِ غم کانپ اٹھی ہے سحر ہونے سے پہلے ہی

پتہ کب تھا مجھے پلکوں کی سولی پر کھڑا کر کے
چلا جائے گا وہ مجھکو خبر ہونے سے پہلے ہی

خبر کیا تھی اُسے ضربِ لہو کی سرد مہری سے
اُگل دے گی صدف قطرہ گہر ہونے سے پہلے ہی

ہے اندیشہ نہ جائے ٹوٹ میرے دل کا آئینہ
سرِ محفل کہیں زیبِ نظر ہونے سے پہلے ہی

کلی گھبرا کے نصرتؔ وقت سے پہلے نہ کھل اُٹھے
پریشاں ہے جو کچی شاخ پر ہونے سے پہلے ہی

○

○

جب بھی غصّے میں وہ ہونٹوں کے کنارے لرزے
میں نے سمجھا کسی مسجد کے منارے لرزے

ذہن میں تیر گئی ایک اُجالے کی لکیر
رات کی آنکھ میں اس وقت ستارے لرزے

وقت نے توڑ دیا کتنے یزیدوں کا غرور
شدتِ پیاس سے جب خون کے دھارے لرزے

تیرا الفاظ کی گلیوں سے گذر جب بھی ہوا
کس قدر ہاتھ اُٹھے کتنے شرارے لرزے

کل جنہیں دیکھ کے لرزی تھی فصیلِ خوں بھی
آج کس واسطے وہ خوف کے مارے لرزے

کس نے الفاظ کی گلیوں میں صدا دی نصرتؔ
کیوں مرے ہونٹ پہ حرفوں کے شرارے لرزے

○

میں آ گیا ہوں تو اُٹھ پیار سے پکار مجھے
زمیں کی گود سے اب چاندمیں اتار مجھے

خیال و فکر کی ٹوٹی ہوئی چٹانوں پر
ملی ہے بولتے لفظوں کی آبشار مجھے

نظر کے دائرے پھیلے تو بستیوں کے نشاں
اُبھر اُبھر کے ملے ہیں افق کے پار مجھے

کیا جو غور تو محفل میں ہم نشینوں کے
یہ زندگی نظر آئی ہے اشتہار مجھے

نظر کے سامنے کیفیت انگور رکھ دینا
مناسب ہے کہاں بوتل کو اتنی دور رکھ دینا

اترنا ہے مجھے ظلمت کے اس گہرے سمندر میں
ہتھیلی پر میری لا کے چراغِ طور رکھ دینا

ملوں گا کس طرح میں روزِ محشر کملی والے سے
میرے سینے میں تہ کر کے کتابِ نور رکھ دینا

انا الحق کی صدا آئے تمہیں جب میری غزلوں سے
مجھے بھی دار پر تم صورتِ منصور رکھ دینا

یہ توہینِ نظامِ مے کشی ہے میری نظروں میں
اٹھا کر ہاتھ میں ساغر نہیں دستور رکھ دینا

مجھے نفرت ہے اس دولت کے بے غیرت غلاموں سے
میرے کاسے میں یا ربّ غیرتِ مزدور رکھ دینا

○

○

میری نظر کو تیری ادا لے کے اُڑ گئی
پانی کی جھیل کالی گھٹا لے کے اُڑ گئی

جلتا تھا اک چراغ بدن کے مکان میں
سنتے ہیں آج وہ بھی قضا لے کے اُڑ گئی

آنگن میں میرے ایک ہی کچّا گلاب تھا
اُس کو بھی حادثے کی ہوا لے کے اُڑ گئی

جو آخری خلوص کا تحفہ تھا دل کے پاس
وہ بھی تو ایک جانِ حیا لے کے اُڑ گئی

نصرتؔ غموں کے کھیت میں سونے سے پیشتر
سب کچھ تو دوستوں کی وفا لے کے اُڑ گئی

○

ہاتھ میں جس نے اٹھا رکھے تھے پتھر کون تھا
تُو نہیں تو تیرے جیسا سیڑھیوں پر کون تھا

کس کے پاؤں میں اتر آئی تھی سورج کی کرن
تو اگر کمرے سے باہر تھا تو اندر کون تھا

جس نے توڑا تھا سکوتِ شب کو شیشے کیطرح
وہ سجیلا نوجواں وہ جانِ محشر کون تھا

دیکھتی تھی جسکو رُک رُک کر گلی کی روشنی
وہ اُجالوں کا محافظ وہ پیمبر کون تھا

چل رہے تھے تیر جو آواز کے سائے تلے
پھینکنے والا انہیں آخر وہ لشکر کون تھا

زلفوں کے جنگل سے آئی صندل کی مہکار مجھے
کس بستی میں لے آئی ہے یہ الھڑ مٹیار مجھے

کاغذ کی تصویریں جیسے تیز ہوا میں اڑتی ہوں
یوں لگتے ہیں چلتے پھرتے چہروں کے بازار مجھے

رات کسی پتھر کی آنکھیں اس شدت سے روئی ہیں
میں نے سمجھا گھیر گئی ہے پانی کی دیوار مجھے

میری خاموشی نے مجھکو تنہائی کا زہر دیا،
میرے ساتھی بھیج رہے ہیں کیوں صدموں کے ہار مجھے

میرے قاتل تیری سوچیں میرے عزم سے کمتر ہیں
جب بھی کیا تو قتل کرے گی لفظوں کی تلوار مجھے

نصرت کتنے بھولے پن سے ننھا مجھ سے کہتا ہے
میری باجی مانگ رہی ہے آج کا دو اخبار مجھے

○

○

دوستو کچھ اہتمام جشن آرائی کرو
ہو سکے تو دور مجھ سے میری تنہائی کرو

ایک شب تو اس گلابی آنکھ کا ساغر چلے
اے خدائے انگلیو اتنی تو دانائی کرو

آنسوؤں کے پیڑ پاؤں میں اگا کر کہہ دیا
زندگی کی دھوپ میں اب دشت پیمائی کرو

رات کی دلدل میں کوئی ساتھ تو دیتا نہیں
دھوپ تک ہی لوگ کہتے ہیں شناسائی کرو

○

○

وہ روشنی جو تری چشم تر سے اُتری ہے
وہ بن کے شعرِ ردائے سحر سے اُتری ہے

صدا کی لہر تڑپتی ہے دل کے دریا میں
تمہاری یاد کی کشتی کدھر سے اُتری ہے

یہ چاندنی جو نشہ دے گئی ہے کمرے کو
سنا ہے تیری گلابی نظر سے اُتری ہے

وہ دھوپ جس سے جلا تھا چراغ طور کبھی
وہ دھوپ آج بھی اس بام و در سے اُتری ہے

ہوا نے گیت جو لکھے شجر کے پتّوں پر
خزاں اُنہی کو لئے اب شجر سے اُتری ہے

یہ برف ہر جگہ نصرتؔ کہاں اُترتی ہے
جہاں بھی اُتری ہے سردی کے ڈر سے اُتری ہے

لہجہ تو ہو بہو تری گفتار ہی کا تھا
جو فاصلہ تھا وہ کسی دیوار ہی کا تھا

تصویر تیری کیوں میری جھولی میں آگری
کیا یہ قصور بھی کسی اخبار ہی کا تھا

ٹیلی وِژن کھلا تو میرے سامنے تھی تُو
یہ معجزہ بھی وقت کی رفتار ہی کا تھا

میں اور اپنے جسم کو ٹکڑوں میں بانٹ دوں
شاید یہ فیصلہ میرے اغیار ہی کا تھا

دیکھا تھا تم نے مجھکو پڑا عکس ریز پر
کہتے ہیں لوگ زخم تو تلوار ہی کا تھا

تو کھڑا ہے صحن میں کیوں سوچ کی چادر لئے
لوگ نکلے ہیں گھروں سے سر پہ اپنا گھر لئے

گر پڑی ہے ٹوٹ کر کیوں خیمۂ گل کی طناب
کیا لٹیرے آرہے ہیں ہاتھ میں خنجر لئے

میں نے جن لوگوں کو اپنے خون کی سوغات دی
میرے استقبال کو اُٹھے ہیں وہ پتھر لئے

کیوں مجھے بھیگی ہوئی آواز آتی ہے تری
میں ترے پہلو سے کب اٹھا ہوں چشمِ تر لئے

جھک کے ملتی ہے انہیں نصرت ہمیشہ زندگی
موت کی وادی میں جاتے ہیں جو اونچا سر لئے

اک بار دیکھ کر مجھے تو مُسکرا کبھی
اے چاند ایک شب میرے پہلو میں آ کبھی

لکھا تھا آنسوؤں نے جسے مخمل کی ریت پر
آ اور آ کے مجھکو وہ نغمہ سُنا کبھی،

اِک فاختہ کے پَر وہاں بکھرے ہوئے ملے
پوچھا تھا جس درخت سے تیرا پتا کبھی

جس میں بڑی لطیف سی خواہش کا نور تھا
آتی نہیں ہے کان میں اب وہ صدا کبھی

دھنک سے بے نیاز ہے سورج کی ہر کرن
کھڑکی بھی کھولتا نہیں دستِ ہوا کبھی

تاروں کے پھول توڑ کے دیتی تھی جب مجھے
آئی نہیں ہے اب تو وہ کالی گھٹا کبھی

○

○

دھوپ گلیوں کی ذرا سی دیر میں ڈھل جائے گی
کب کوئی لڑکی مرے اُجڑے ہوئے گھر آئے گی

سو گیا ہے وہ گلوں کی پتیوں سے کھیلتا
نیند کیا اُس کو میرے پہلو میں بھی آجائے گی

دن گذارا ہے تری یادوں کے گلدستوں کے ساتھ
رات ناگوں کی پٹاری ہے مجھے تڑپائے گی

گُل کی شریانوں میں دوڑائی ہے میں نے زندگی
شاخ توڑو گے تو میرے خون کی بو آئے گی

پیار کے پنچھی اڑیں تو لوٹ کر آتے نہیں
میرے بارے میں تمہیں دنیا یہی سمجھائے گی

کھینت نصرت کہہ رہے ہیں اٹھ کے ہم سے پیار کر
ورنہ خطرہ ہے زمیں بھی آسماں بن جائے گی

اس نے تصویریں بنا رکھی ہیں یوں دالان میں
زندگی سوئی ہوئی ہو جیسے قبرستان میں

ہم نے لمحوں سے نچوڑا جب بھی صدیوں کا لہو
کھیتیاں الفاظ کی اُگنے لگی اذہان میں

اپنی پھونکوں سے بجھا دے میری پلکوں کے چراغ
اتنی ہمدردی کہاں ہے آج کے انسان میں

اب میری جانب اٹھا کر آنکھ بھی تکتا نہیں
گل سجا کر خوش ہوا تھا جو مجھے گلدان میں

زلف کے بادل میری آواز تک سنتے نہیں
مجھکو نصرت دیکھکر اس تھل کے ریگستان میں

○

ترے بدن کی رفاقت گماں سے اونچی تھی
یہ وہ زمین تھی جو آسماں سے اونچی تھی

کِھلا ہوا تھا جہاں پر گلاب قسمت کا
وہ شاخ بھی تو مرے آشیاں سے اونچی تھی

بجا رہے ہیں جو خطرے کی گھنٹیاں پتے
چلی نہیں وہ ہوا جو نشاں سے اونچی تھی

کسی نے لفظ میں نصرتؔ چھپا لیا ہے مجھے
یہ بات وہ ہے جو حدِ زباں سے اونچی تھی

○

○

پڑھ لیا کرتی ہیں آنکھیں جسم کے پیندار سے
جو بھی وابستہ کہانی ہو کسی کردار سے ..

اس طرح اتری دریچے سے گلی میں روشنی
جس طرح سایہ اترتا ہے کسی دیوار سے،

ٹوٹ ہی جائے نہ دھرتی سے کہیں رشتہ میرا
خوف سا آنے لگا ہے وقت کی رفتار سے

موت کی آغوش سے اٹھ کر چلا آؤں گا میں
تم پکارو تو سہی اک بار مجھ کو پیار سے

ذہن کی گلیوں میں پہرے دار نفرت دیکھ کر
بوئے خوں آنے لگی مجھ کو مرے افکار سے

○

○

کچھ تبصرہ ہوتا کوئی تنقید تو کرتے
فن میری وراثت نہیں تردید تو کرتے

میں سوچ کو قرطاس کے زانو پہ بٹھاتا
وہ اپنی زباں سے میری تائید تو کرتے

شہرت کی کنیزیں میرے رستے میں کھڑی ہیں
شہرت کے پجاری میری تقلید تو کرتے

اک بار ہی کھڑکی سے کوئی چاند نکلتا
ہم اہلِ محرم بھی کبھی عید تو کرتے،

○

○

جب تیر میرے جسم کی دیوار پر لگے
اشکوں کے پھول کیوں ترے رخسار پر لگے

تو رو پڑا تھا پھول چڑھا کر مزار پر
پتھر وفا کے میرے دلِ زار پر لگے،

کچھ لوگ آج پھر ہوئے رخصت جہان سے
کچھ اور آج حاشیے اخبار پر لگے

آمد ہے آج شہر میں کس شہریار کی
پہرے دکھائی دیتے ہیں بازار پر لگے

دیتے نہیں دکھائی مجھے اب جہان میں
کہتے تھے جو کہ داغ نہ دستار پر لگے

نصرتؔ وہ ایک پھول ہے کچھ احتیاط کر
ایسا نہ ہو کہ داغ رُخِ یار پر لگے

○

آنسو کسی کے یوں سرِ رخسار گر پڑے
جیسے تعلقات کی دیوار گر پڑے

توڑا کسی کلائی نے چوڑی کو اس طرح
پانی میں جیسے چاند کی تلوار گر پڑے

اُٹھنے لگی ہیں سوچ کے کھیتوں سے آندھیاں
ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی دستار گر پڑے

شہرت تو اک کنیز ہے فن کے دیار کی
سننا نہ ہو کہ عظمتِ فنکار گر پڑے

○

الفاظ بولتے تو یہ تحریر بولتی
شب کے سکوت میں تری تصویر بولتی

مجھکو غموں کے جلتے بھنور میں اتار کر
ساقط کھڑی تھی کیوں میری تقدیر بولتی

اب میرا جسم بھی میری تحویل میں نہیں،
وہ پوچھتے تو پاؤں کی زنجیر بولتی

اک پھول تھا جو شاخ پہ تنہا کھلا رہا،
یہ خواب تھا تو خواب کی تعبیر بولتی

نقشے پہ میرے جسم کے ٹکڑوں کو دیکھ کر
مقتل اگر تھا چپ تو یہ شمشیر بولتی،

○

اینٹ کی دیوار ہے فوراً اٹھالی جائے گی
آج پھر اک شہر کی بنیاد ڈالی جائے گی،

رات کے پچھلے پہر اس چاندنی کے نور سے
ذہن میں الفاظ کی یہ فصل پالی جائے گی

ناچنے دو ایک پاگل کو ذرا اسٹیج پر
دور تک پھر دیکھنا جلسے کی تالی جائے گی

بن سنور کر کار میں بیٹھی ہوئی ہیں لڑکیاں
سوچتا ہوں کس کے گھر نصرتؔ یہ ڈالی جائے گی

○

○

کھیتوں کی گود چاند کا ہالہ دکھا مجھے،
اپنے گلے میں ڈال کے مالا دکھا مجھے

اُترا تھا ایک دن جو مرے دل کے طور پر
اک روز پھر کبھی وہ اُجالا دکھا مجھے

لفظوں سے گفتگو کو سجا کر نہ پیش کر،
دے کر حدیثِ دل کا حوالہ دکھا مجھے

بُزدل نہیں تو خون کے دریا میں کود جا
بھر کر یہ زہر کا نہ پیالہ دکھا مجھے

خاموش کر دیا تجھے خوفِ صلیب نے
نصرتؔ لبوں کا توڑ کے تالہ دکھا مجھے

○

○

سُرخی میرے لہو کی گھٹاؤں کے ساتھ تھی
بچھڑے ہوؤں کی یاد ہواؤں کے ساتھ تھی

اُترا ہوا تھا خون بھی آنکھوں کی جھیل میں
اک غم کی کیفیت بھی دعاؤں کے ساتھ تھی

بُنتی تھیں روز لڑکیاں پھولوں کی چادریں
بستی شہید کی میرے گاؤں کے ساتھ تھی

آنسو برس پڑے تھے بہاروں کی آنکھ سے
کیا لذتِ فراق خزاؤں کے ساتھ تھی

نصرتؔ ہوا خیال کا جب بھی میں ہم سفر
تاروں کی رہگذر میرے پاؤں کے ساتھ تھی

○

○

مت کیجئے خیال کہ کچھ ہے بھی یا نہیں
مطلب ہی جس کا نہ ہو میں ایسی صدا نہیں

میں وہ ہوں جس کے پاؤں پہ سجدہ کیا گیا
میں حرفِ کائنات ہوں میں نقشِ پا نہیں

وہ روشنی جو طور کی آنکھوں کا نور تھی
تو دیکھ تو سہی ترے پہلو میں کیا نہیں

ڈھونڈوں تجھے خیال کے جنگل میں کس طرح
آؤں میں کس طرف سے کوئی راستہ نہیں

○

○

خون کے چھینٹے پڑے ہیں چہرۂ افکار پر
کون کھینچا جا رہا ہے آنسوؤں کی دار پر

اے میرے ساتھی مجھے الفاظ کے پتھر نہ مار
وقت کو تنقید کرنے دے میرے کردار پر

اپنے کندھوں پر اٹھائے آپ اپنی لاش کو
چل رہا ہوں رات دن میں سانس کی تلوار پر

اک دریچے سے ذرا سی روشنی اتری تو تھی
رات چھاپے مارتی پھرتی ہے ہر دیوار پر

حادثے اتنے مسلسل ہو رہے ہیں رات دن
روز کالا حاشیہ ہوتا ہے ہر اخبار پر

کیسے کیسے پھول نصرتؔ شہر کی زینت رہے
کوئی بھی پورا نہ اترا وقت کے معیار پر

ہلی ہے شاخ یا کوئی اٹھا انگڑائیاں لیکر
چلی ہے دھوپ آنگن سے کہاں رعنائیاں لیکر

دیئے الفاظ کے سوچوں کی دیواروں پہ جلنے دو
شبِ وعدہ کھڑی ہے ہاتھ میں پرچھائیاں لیکر

میری سوچوں کو تو شبنم کے قطرے میں سمٹنے دے
ملے گا کیا مجھے اس بحر کی پہنائیاں لے کر۔

کسی کی آنکھ میں قطرے کی صورت لوٹ آیا ہے
اٹھا تھا قلزمِ ہستی سے جو گہرائیاں لے کر،

کبھی فرصت ملے تو پوچھنا بے خواب آنکھوں سے
بتایا جاتا ہے کیسے جاگتی تنہائیاں لے کر

میں نصرتؔ سوچ کی کانوں سے جب ہیرے نکالوں گا
مچل کر زندگی آئے گی پھر شہنائیاں لے کر

○

سو گئی تصویر جب تیری جگا دی جائے گی،
موم کی کمرے میں اک بتی جلا دی جائے گی

میں کرن بن کر اتر آؤں گا روشندان سے
دیکھ لینا جب کبھی مجھ کو صدا دی جائے گی

آسماں سے بہتے پانی میں اُتارا جائے گا
چاند پاگل ہے تو اس کو یہ سزا دی جائے گی

چھپ کے جو بیٹھا ہوا ہے خیمۂ الفاظ میں
آئینے میں اس کی صورت بھی دکھا دی جائے گی

جس خبر کے واسطے تم گوش بر آواز ہو
وہ خبر بھی ایک دن تم کو سنا دی جائے گی

کانپتے ہونٹوں سے اس لڑکی نے اتنا تو کہا
آج نصرتؔ داد تجھ کو بر ملا دی جائے گی

○

جسم کی جھیل میں اِک بار تو ڈوبا ہوتا،
تو جو سورج تھا میرے ذہن سے اُبھرا ہوتا

رقص پر سلوٹیں مجبور اُسے کر دیتیں
بہتے پانی میں اگر چاند بھی اُترا ہوتا،

میرے بارے میں سُنی تم نے ہزاروں باتیں
مجھکو اک بار تو خود بھی کبھی پرکھا ہوتا

میں تجھے سوچ کی تصویر دکھاؤں کیسے
تو کسی لفظ کی گلیوں سے تو گزرا ہوتا،

تو نے جن لمحوں کی سولی پہ چڑھایا ہے مجھے
ایسا اک لمحہ کبھی تم پہ بھی آیا ہوتا،

دُکھ اگر تھا تجھے نصرت سے بچھڑ جانے کا
ایک تارا ہی تری آنکھ سے ٹوٹا ہوتا

○

ہوا کے ہاتھ میں پتّا نہیں تھا پتھر تھا
میری وفا کا دیا بھی ہوا کی زد پر تھا

ہوس کی دھوپ بدن کے مکاں سے باہر تھی
مگر یہ عشق کا سورج مکاں کے اندر تھا

لہو میں ڈوبے ہوئے آسماں کے تارے تھے
زمیں پہ پھیلا ہوا خون کا سمندر تھا

بنی جو پھول چمن میں تری جوانی تھی
گرا جو آنکھ سے آنسو مرا مقدّر تھا

امیرِ شہر اُسے توڑ کے بھی خوش نہ ہوا
وہ برگِ سبز جو سُندر کلی کا بستر تھا

خود سے اپنا آپ چھپاتا رہتا ہوں
جوگی بن کر خاک اڑاتا رہتا ہوں

سوچوں کی قبروں پر بیٹھا رات گئے
میں لفظوں کے دیپ جلاتا رہتا ہوں

پاگل ہو کر ذہن کی اندھی گلیوں میں
چاند کو اپنے پاس بلاتا رہتا ہوں،

اب تک تو معلوم نہیں ہے مجھ کو بھی،
کس کی میں تصویر بناتا رہتا ہوں

کاغذ کی کشتی کو چھوڑ کے پانی میں،
لہروں کی شاخوں کو ہلاتا رہتا ہوں

لفظوں کی دیوار کے پیچھے شام ڈھلے
اِک لڑکی کو گیت سناتا رہتا ہوں

میرے ہمسائیوں کو نصرتؔ شکوہ ہے
میں راتوں کو شور مچاتا رہتا ہوں،

○

○

کُھلا ہے کیسے دریچہ کوئی صدا تو نہیں
تو اُٹھ کے دیکھ کہیں سرپھری ہوا تو نہیں

یہ روشنی کی لکیریں ڈرا رہی ہیں مجھے،
لگی ہیں آج کوئی شخص جاگتا تو نہیں

میں تیرے سامنے جانے سے کیوں جھجکتا ہوں
بسا ہوا ترے اندر کوئی خدا تو نہیں

میری رگوں میں ستارے نچوڑنے والے
تو فن کی آگ ہے تو سوچ کا دیا تو نہیں

میں اپنے خون کی بوندوں کو کس طرح پی لوں
میری وفاؤں کا یہ آخری صِلا تو نہیں

تُو اپنے جسم کی بوتل میرے حوالے کر،
یہ میرا زادِ سفر ہے مطالبہ تو نہیں

○

○

آنسو رُکا ہوا جو مِری چشمِ تر میں تھا
میری طرح سے وہ بھی اکیلا ہی گھر میں تھا

شاید کوئی ملاپ کی صورت دکھائی دے
میں زینۂ صدا پہ مسلسل سفر میں تھا،

ذہنوں کے انقلاب کی یلغار روک لے
یہ حوصلہ کہاں کسی دیوار و دَر میں تھا

گھبرا گئے تھے دیکھ کے آنکھوں کے آئنے
ایسا بھی ایک حادثۂ غم کے بھنور میں تھا

جس کیلئے خیال کی گلیاں اُداس تھیں،
وہ پھُول سا بدن تو میری رہگذر میں تھا

نصرتؔ یقیں نہیں ہے تو پتّوں کو سونگھ لے
میرا ہی وہ لہو تھا جو شاخِ شجر میں تھا

○

○

دیکھکر ہاتھوں میں اس کے آئینہ ٹوٹا ہوا،
ذہن میں اُبھرا میرے اک واقعہ بھولا ہوا!

ریت کے ٹیلے پہ وہ لڑکی ملی تھی اس طرح
یوں لگا جیسے کہ ہے منظر کوئی دیکھا ہوا

لکھ دیا ہے اُٹھ کے طغیانی نے اب جو فیصلہ
اس تو مدت سے تھا دریاؤں نے سوچا ہوا

رات رو رو کر اُجالے کو جنم دیتی رہی
ہر طرف سورج کی کرنوں کا مگر چرچا ہوا

سوچتا ہوں کون سی تاریخ دہرائی گئی
کیوں پرانا زخم میرا آج پھر تازہ ہوا

لوگ دھوئیں گے نئے سونے کے پانی میں اسے
یہ لباسِ شعر تھوڑا سا اگر میلا ہوا

غوطہ زن ہوتا ہوں نصرتؔ آنسوؤں کی جھیل میں
دیکھتا ہوں جب ضمیرِ قوم کو سویا ہوا

منوّر میرے سپنوں کی گلی ہے
کسی چہرے کی شاید روشنی ہے

ہوائیں وہ عبارت پڑھ رہی ہیں
جو میں نے ریت پر اب تک لکھی ہے

کہوں کس سے کہ پرچھائیں کسی کی
میرا کب سے تعاقب کر رہی ہے

لکیروں سے غزل کاڑھی تھی میں نے
تری تصویر کیسے بن گئی ہے

دریچہ بند کب سے ہو چکا ہے
فضا میں آگ پھر بھی جل رہی ہے

○

ضرورت ہے اُسے میرے لہو کی
مجھے یہ آج ہی چھٹی ملی ہے

خود اپنے ہی لہو میں تیر جانا
زمانے کی نظر میں خودکشی ہے

جلاتا ہوں میں جب کمرے میں بتی
مری تصویر مجھ کو گھورتی ہے

جھروکے میں نہیں ہے اور کچھ بھی
مگر اک شے گلابی پھول سی ہے

نکل آئے ہیں نصرتؔ میرے آنسو
کسی نے بات ہی ایسی کہی ہے

○

○

چہرہ کسی کا جب بھی مجھے چاند سا لگا
مجھکو مرا مزاج ہی بدلا ہوا لگا

دیکھا جو آئینے کے کبھی روبرو اُسے -
سمٹا ہوا زمیں کا وہاں فاصلہ لگا

جب مجھ سے ترے سائے نے کی آکے گفتگو
مشعل بدست مجھکو مرا راستہ لگا

پتھرا گئی تھیں دیکھ کے آنکھیں زمین کی
پانی میں جب یہ چاند میرا نقش پا لگا

میں سوچتا ہوں اس کا میں کس سے گلہ کروں
میرا ہی خون جب مرے ہاتھوں پہ آ لگا

قرطاس کی طرف چلے لفظوں کے قافلے
کتنا حسین تیر مجھے آپ کا لگا

نصرت یہ انتظار کی منزل ہے کونسی
جھونکا ہوا کا بھی مجھے اس کی صدا لگا

○

میں اکیلا ہی وہاں تھا دوسرا کوئی نہ تھا
آئینہ تھا دستِ گل میں دیکھتا کوئی نہ تھا

خوف کے گنبد میں تھے سب کے بدن ٹوٹے ہوئے
بے حسی ایسی تھی پھر بھی بولتا کوئی نہ تھا

ڈھونڈتی پھرتی تھی ہر جانب صدا الفاظ کی
ہر کوئی سویا ہوا تھا جاگتا کوئی نہ تھا

رو پڑا اس دکھ سے چشمے کی طرح پتھر کا شہر
مدتیں گذریں وہاں آیا گیا کوئی نہ تھا

دیپ جل کر شب کے سناٹے کو کیسے توڑتے
سب کے سب خاموش تھے اور بولتا کوئی نہ تھا

تو ہوا تقسیم جب لفظوں میں تو شہرت ہوئی
اس سے پہلے تو تجھے بھی جانتا کوئی نہ تھا

میری نیندوں کا لہو بکتا کہاں بازار میں
شعر کہنے کا یہاں نصرتؔ صلا کوئی نہ تھا

یہ خوف کی میت جو دماغوں سے نکلتی
پھر سوچ کی خوشبو مرے لفظوں سے نکلتی

لپٹا ہوا سائے میں ہے یہ رات کا آنگن
جسموں کی چمک اب تو دریچوں سے نکلتی

احساس کے زخموں سے ہے بوجھل مرا سینہ،
پانی کی کوئی بوند ہی آنکھوں سے نکلتی

جس شکل نے آ کر ہیں اڑا لی میری نیندیں
وہ کیسے تصور کے جزیروں سے نکلتی،

جاتی ہو جو معصوم اُجالوں کے نگر میں
ایسی بھی کوئی راہ دھندلکوں سے نکلتی

قرطاس پہ لفظوں میں بکھرتا نہ اگر میں
یہ پیار کی آواز نہ ہونٹوں سے نکلتی

پھیلا ہوا جس سوچ کا صدیوں پہ ہے سایہ
نصرتؔ وہ مری سوچ ابھی لمحوں سے نکلتی

○

○

دیمک لگی ہوئی وہ شجر کی جڑوں میں ہے
نفرت دبی دبی سی جو اونچے گھروں میں ہے

آئے ہوئے ہیں شہر دھوئیں کی لپیٹ میں
عظمت کی سرخ آگ ابھی جنگلوں میں ہے

بامِ اُفق اُچھال وہ سورج خیال کا
اب تک چھپا ہوا جو کہیں ظلمتوں میں ہے

سونگھا تو اس کی باس نے چونکا دیا مجھے
میرا ہی وہ لہو ہے جو گل کی رگوں میں ہے

اُٹھ کر تو زندگی کے خزانے تلاش کر
سب کچھ پڑا ہوا تو زمیں کی تہوں میں ہے

نصرتؔ تو جسکے کیف کی کرتا ہے جستجو
کہتے ہیں وہ شعور ابھی مقبروں میں ہے

○

طویل رات ہے ہو گی یہ مختصر کیسے
چکھیں گے ہونٹ مرے لذّتِ سحر کیسے

میں سوچتا ہوں کہ تجھ سے بچھڑ کے کیا ہو گا
ترے بغیر کٹے گا مرا سفر کیسے

مجھے یقیں نہیں آتا یہ کیسے ممکن ہے
مجھے بلائے گا تو اور اپنے گھر کیسے

اُجڑ کے خاک ہُوا جو تمہاری غفلت سے
تمہی کہو کہ بسے گا وہ اب نگر کیسے

ملا نہ تُو تو مری سانس ٹوٹ جائے گی
بچا سکے گا مجھے کوئی چارہ گر کیسے

لگی ہے چوٹ یا رو دیا ہے کوئی ہمسایہ،
ہوئی ہے کچھ تو بتا آنکھ تری تر کیسے

وہ آسکا نہ تو پوچھے گا کون لوگوں سے
سپردِ خاک ہوئے میرے بال و پر کیسے

جھکا جو تو کبھی نصرت جہانِ فانی میں
چلے گا پھر یہاں کوئی اٹھا کے سر کیسے

○

یہ پھول بھی الفاظ کے گملوں میں سجا دے
آنچل ذرا ہنستے ہوئے چہرے سے ہٹا دے

اک رات تو اس ریشمی زانو پہ بٹھا کر.
ہونٹوں کی عدالت سے مجھے کوئی سزا دے

کل تک تو تراشے ہوئے پتھر بھی خدا تھے
میں تیرا پجاری ہوں مجھے اس کا صلا دے

سر سامنے شب کے تو جھکایا نہیں میں نے
اب تو مرے ہاتھوں میں تو سورج کا دیا دے

دولت کے پہاڑوں میں مرے کرب کے تیشے!
مجھکو بھی مرے فن کی بلندی کا پتا دے

آنکھوں کے دریچوں سے ابھی کودنے والے
آنسو نہیں شعلے ہیں یہ مت ان کو ہوا دے

کہتی ہیں یہ نصرتؔ میری جاگی ہوئی آنکھیں
سوئے ہوئے انصاف کی زنجیر ہلا دے

○

○

رات کی میّت اٹھی زنداں کے در کھولے گئے،
دھوپ تب نکلی ہے جب سورج کے پر کھولے گئے

آئینے اٹھے ہیں استقبال کرنے کے لئے
کس کی خاطر آج یہ شیشے کے گھر کھولے گئے

وقت کے ٹھنڈے بدن کو بھی پسینہ آ گیا
جب کسی محفل میں زلفوں کے بھنور کھولے گئے

لفظ کے مندر سے نکلیں ریشمی پرچھائیاں
کس صحیفے کے ورق اے دیدہ ور کھولے گئے

کہہ رہے ہیں ان خطوں کے ادھ کھلے چہرے مجھے
راستے میں یہ کہیں پر نامہ بر کھولے گئے،

میرا دعویٰ ہے کہ اٹھے گی صدائے انقلاب
خون میں ڈوبے ہوئے پرچم اگر کھولے گئے

سوچ کی بستی پہ ننگے آدمی کا راج تھا
ارتقا کے جب دریچے چشمِ تر کھولے گئے

آنگنوں سے جھوم کر اٹھی ہیں پاگل بدلیاں
جب ترے گیسو ستاروں کے نگر کھولے گئے

گر پڑے اس دن ہی بوڑھی سوچ کے کچّے مکان
ان میں نصرتؔ جب نئی سوچوں کے در کھولے گئے

○

۵

خوف سا آنے لگا ہے آج کل سپنوں سے بھی
ٹوٹنے والے ہیں اب تو رابطے لفظوں سے بھی

کہہ رہی ہے کیوں مرے کانوں میں یہ پاگل ہوا
بوئے خوں آتی ہے مجھکو ریشمی پردوں سے بھی

جب سے اس لڑکی نے مجھکو دوستو دھوکا دیا
مجھکو نفرت ہو گئی ہے خوشنما چہروں سے بھی

دیپ ہوں خود کو جلا کر دوں گا بینائی تمہیں،
مجھکو ٹکرانا پڑا گر نت نئے صدموں سے بھی

میں کسی آفت کے آگے سر جھکا سکتا نہیں
زندگی کو چھین لوں گا بھاگتے لمحوں سے بھی

روک سکتا ہے اُنہیں کیسے کوئی نصرتؔ بتا،
دل میں آجاتے ہیں جو آنکھوں کے دروازوں سے بھی

○

لفظوں کے پیالے

لفظوں کے بیچتا ہوں پیالے خرید لو
شب کا سفر ہے کچھ تو اُجالے خرید لو

ہوگا امیرِ شہر کا مجھ سے نہ احترام
میری زباں کے واسطے تالے خرید لو

فرقت کی رات جاگتے لمحوں کی سیج پر
یہ چاند بھی مجھے مرا قاتل دکھائی دے

آتی ہے یوں نظر تری کھڑکی کی روشنی
جیسے کسی کو دور سے ساحل دکھائی دے

تو چل دیا تو چاند ستارے بھی چل دیئے
خنجر چلا تو خون کے دھالے بھی چل دیئے

اُٹھا کچھ اس طرح تری آواز کا بھنور،
کشتی کے ساتھ ساتھ کنارے بھی چل دیئے

ڈالی ہے کس نے جلتی نظر کائنات پر
یہ کیا ہوا کہ پھول کِھلے جھیل جَل اٹھی،

یہ کون تھا کہ جس نے الٹ دی نقابِ رُخ
پانی کی تہ میں چاند کی قندیل جل اُٹھی

○

زندگی دوڑ پڑی خوف کا چہرہ پہنے
وقت کا جسم جلا، خون کے دھارے ناچے

خود بخود لے کے چلی آئیں سفینہ لہریں
ناخدا ڈوب گیا اور کنارے ناچے

○

دیکھ کر باغ میں کلیوں کے تبسّم کی نمو
وجد میں جھوم کر آنے لگے غنچوں کے سبو

جب کسی ہونٹ پہ چاندی کی کرن پھوٹ پڑی
عارضِ گل سے ٹپکنے لگا کانٹوں کا لہو،

○

روشنی پر گفتگو کچھ اس حوالے سے ہوئی
رات کی تخلیق کہتے ہیں اُجالے سے ہوئی

بزمِ رنداں میں اُسی کو معتبر جانا گیا
مے کشی کی ابتدا جس کے پیالے سے ہوئی

وہ دیئے کب بجھے ہیں آندھی سے
دل کی محراب پر جو جلتے ہیں

مجھ پہ چشمے نے انکشاف کیا
پتھروں کے بھی دل پگھلتے ہیں

○

الٹوں تری نقاب کہ شب کو اُجال دوں
یا آسماں کے ہاتھ میں چاندی کا تھال دوں

گم سُم ہے کائنات کی ہر شے ترے حضور
اب تو ہی سوچ میں تجھے کس سے مثال دوں

○

اشکوں کے داغ دامنِ رخسار پر بھی تھے
لہروں کے پھول ریت کی دیوار پر بھی تھے

سورج کا خون رات کی دہلیز پر ہوا
چھینٹے لہو کے شام کی تلوار پر بھی تھے

تیرگی کی آنکھ میں تاروں کو تولا جائے گا
دن کا دروازہ بڑی جرأت سے کھولا جائے گا

اے میرے اُڑتے خیالوں کے پرندو سوچ لو
زہر بھی سقراط کے ساغر میں گھولا جائے گا

مصنّف کی دوسری کتابیں

۱۔ ضربِ خیال

۲۔ زخمی سورج (زیرِ طبع)